الرسالہ

Al-Risāla

February 2005 • No. 339 • Rs. 10

اگر تم دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ نہیں کر سکتے تو دوسروں کے ساتھ بدخواہی کا معاملہ بھی نہ کرو۔

تذکیر القرآن

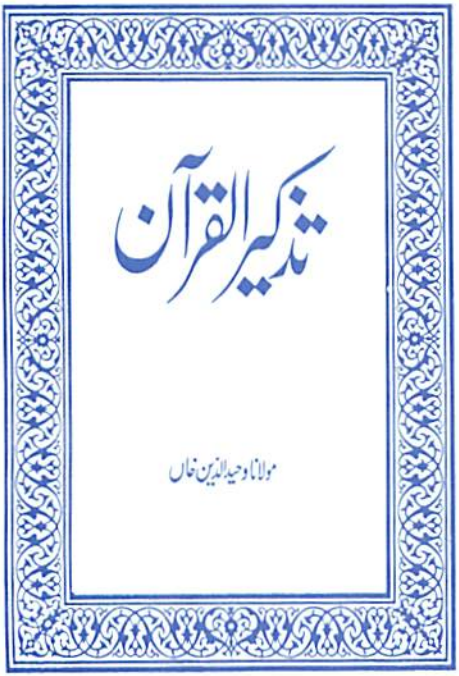

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ: ۴۰۰ روپے (ہارڈ باؤنڈ)

۲۵۰ روپے (پیپر بیک)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-13
Tel. 2435 6666, 2435 5454
Fax: 2435 7333
email: info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $20 (Air Mail)

Distributed In England by
IPCI: Islamic Vision
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info @ ipci-iv.co.uk

Distributed in the USA by
Al-Risala Forum International
2665 Byberry Rd.
Bensalem, PA 19020 (USA)
Tel/fax: 215-639-3584
e-mail:caleem@juno.com

Printed and published
by Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

فروری 2005

فہرست

انسانی شخصیت 2
موت کی دستک 4
سرچشمۂ اعتماد 5
حسن اخلاق کے نمونے 7
انسان کا المیہ 8
خدا اور آخرت 13
دنیا اور آخرت 23
عاجلانہ اقدام 24
وقت کی پابندی 25
اپنے کام سے کام 26
تازک پارسل 28
ایک غلطی 29
ترقی کا سیلاب 30
گر کر اٹھنا 32
نہ لڑنا بھی ایک اصول ہے 33
دو قسم کے انسان 34
زندگی کی جدوجہد 35
اعتراف نئے دور کا آغاز 36
زحمت بھی رحمت ہے 37
حقیقت پسندانہ مزاج 38
کامیاب زندگی 39
سادگی کی اہمیت 40
محنت، پلاننگ 41
نہ کرنا بھی کام ہے 42
تعلیمی پیغام 43
خبرنامہ اسلامی مرکز ۱۶۷ 44

انسانی شخصیت

کیمسٹری کا پہلا سبق جو ایک طالب علم سیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی صورت بدل لیتی ہے:

Nothing dies, it only changes its form.

اس عالمی کلیہ سے انسان کے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جس طرح مادہ کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ جلنے یا پھٹنے یا کسی اور حادثہ سے وہ فنا نہیں ہوتا بلکہ شکل بدل کر دنیا کے اندر اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔ اسی طرح ہم مجبور ہیں کہ انسان کو بھی ناقابل فنا مخلوق سمجھیں اور موت کو اس کے خاتمہ کے ہم معنیٰ قرار نہ دیں۔

یہ محض بالواسطہ قیاس نہیں بلکہ ایک ایسا واقعہ ہے جو براہ راست تجربہ سے ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر علم الخلیہ (cytology) بتاتا ہے کہ انسان کا جسم جن چھوٹے چھوٹے خلیوں (cells) سے مل کر بنا ہے وہ مسلسل ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ایک متوسط قد کے انسان میں ان کی تعداد تقریباً ۲۶ پدم ہوتی ہے۔ یہ خلیے کسی عمارت کی اینٹوں کی طرح نہیں ہیں جو ہمیشہ وہی کے وہی باقی رہتے ہوں۔ بلکہ وہ ہر روز بے شمار تعداد میں ٹوٹتے ہیں اور غذا ان کی جگہ دوسرے تازہ خلیے فراہم کرتی رہتی ہے۔ یہ ٹوٹ پھوٹ ظاہر کرتی ہے کہ اوسطاً ہر دس سال میں ایک جسم بدل کر بالکل نیا جسم ہو جاتا ہے۔ گویا دس برس پہلے میں نے اپنے جس ہاتھ سے کسی معاہدہ پر دستخط کئے تھے وہ ہاتھ اب میرے جسم پر باقی نہیں رہا۔ پھر بھی ''پچھلے ہاتھ'' سے دستخط کیا ہوا معاہدہ میرا ہی معاہدہ رہتا ہے۔ جسم کی تبدیلی کے باوجود اندر کا انسان پہلے کی طرح اپنی اصل حالت میں موجود رہتا ہے۔ اس کا علم، اس کا حافظہ، اس کی تمنائیں، اس کی عادتیں، اس کے خیالات بدستور اس کی ہستی میں شامل رہتے ہیں۔ اسی لئے ایک حیاتیاتی عالم نے کہا ہے کہ انسانی شخصیت تغیر کے اندر عدم تغیر کا نام ہے:

Personality is changelessness in change.

اگر صرف جسم کے خاتمہ کا نام موت ہو تو ایسی موت تو ''زندہ'' انسانوں کے ساتھ بھی ہر روز پیش آتی رہتی ہے۔ ساٹھ سال کی عمر کا ایک شخص جس کو ہم اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھتے ہیں، وہ جسمانی خاتمہ کے معنی میں چھ بار مکمل طور پر مر چکا ہے۔ اب چھ بار کی جسمانی موت سے اگر ایک انسان نہیں مرا تو ساتویں بار کی موت سے کیوں اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو موت کے بعد بھی زندہ موجود رہتا ہے۔ دوسری چیزیں اگر گیس کی صورت میں باقی رہتی ہیں تو انسان اپنے شعوری وجود کی صورت میں اپنے وجود کو باقی رکھتا ہے۔

موت کے بعد زندگی کے اور بھی بہت سے استدلالی قرائن ہیں ان میں سے ایک نطق (الذاریات ۲۳) ہے۔ انسان کا بولنا ایک انتہائی عجیب ظاہرہ ہے۔ نطق آدمی کی پوری شخصیت کی علامت ہے۔ یہ نطق حیرت انگیز طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔

آواز کی ریکارڈنگ کے جدید طریقوں نے اس حقیقت کو ایک معلوم اور معروف چیز بنا دیا ہے۔ ۲۴ اگست ۲۰۰۰ کی صبح کی خبروں میں میں نے ریڈیو پر سنا کہ ہندستان کے مرکزی وزیر مسٹر کمار منگلم کا آج صبح سویرے دہلی میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد رات کو آٹھ بجے دوبارہ جب میں نے ریڈیو کو کھولا تو اس میں اس کی تفصیلی خبر کے ساتھ وفات یافتہ وزیر کا ایک بیان ان کی اپنی آواز میں سنایا جا رہا تھا جو انہوں نے اپنی موت سے کچھ پہلے دیا تھا۔ جب میں نے ان کی آواز کو سنا تو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے ایک شخص جو مر گیا تھا وہ دوبارہ زندہ ہو گیا ہے اور اٹھ کر لوگوں کے سامنے بول رہا ہے۔

نطق کے بارہ میں یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو جدید ریکارڈنگ کے دور میں ہر ایک کے سامنے آ رہا ہے۔ یہ گویا خدا کی ایک نشانی ہے جو ظاہر ہو کر انسان کو بتا رہی ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں مر کر آخرت کی دنیا میں دوبارہ جی اٹھنا ہے۔

موت کی دستک

موت ہر آدمی کے گھر پر دستک دیتی ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ موت پہلی دستک کے بعد ہی گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور آدمی کی روح کو قبض کر لیتی ہے۔ وہ اچانک دنیا کے امتحان گاہ سے نکال کر آخرت میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے اعمال کا انجام پائے۔

اچانک موت کا یہ معاملہ مختلف صورتوں میں پیش آتا ہے۔ مثلاً دل کا تیز دورہ پڑا اور فوری طور پر آدمی کی موت واقع ہو گئی۔ سڑک پر سخت حادثہ پیش آیا اور ایک لمحہ کے اندر زندہ انسان مردہ انسان میں تبدیل ہو گیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان صحت کی حالت میں رات کو سویا اور صبح ہوئی تو بستر پر صرف اس کی بے جان لاش پڑی ہوئی تھی۔ اچانک موت بلاشبہہ بے حد سنگین موت ہے کیونکہ آدمی کو اس میں یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ موت سے پہلے اپنی غلطیوں کی تلافی کر سکے۔

دوسری صورت وہ ہے جب کہ موت بار بار ایک آدمی کے گھر پر دستک دیتی ہے لیکن اندر داخل ہونے سے پہلے ہی وہ لوٹ جاتی ہے۔ اس واپسی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً آدمی بیمار ہو کر اچھا ہو جائے۔ سخت حادثہ پیش آجانے کے باوجود وہ موت سے بچ جائے۔ اس کے اوپر حملہ کیا جائے لیکن حملہ آور کا نشانہ خالی چلا جائے، وغیرہ۔

یہ دوسری قسم آدمی کو بار بار موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں سوچے۔ وہ اپنی زندگی پر نظر ثانی کرے اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے زیادہ صحیح زندگی گزارنے کا فیصلہ کرے۔ موت کا آپ کے دروازہ پر دستک دے کر چلا جانا گویا اس بات کا الارم ہے کہ ہوشیار ہو جاؤ۔ جلد ہی تمہارا آخری وقت آنے والا ہے۔ اپنی اصلاح کر لو، اس سے پہلے کہ اصلاح کا وقت ہی باقی نہ رہے۔ ہر آدمی موت کی زد میں ہے۔ کوئی بھی چیز آدمی کو موت سے بچانے والی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی آج مرنے والا ہے اور کوئی وہ ہے جس پر کل کے دن موت آئے گی۔ موت کی یاد سے بہتر کوئی معلم انسان کے لئے نہیں۔

سرچشمۂ اعتماد

۲۷ جنوری ۲۰۰۰ کو دہلی میں میرے ساتھ ایک جانکاہ ذاتی حادثہ پیش آیا۔ میرا ایک نوجوان پوتا سڑک کے ایک حادثہ میں اچانک وفات پاگیا۔ ۲۸ جنوری کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد اوکھلا کی مسجد میں نماز جنازہ ہوئی اور جامعہ کے قبرستان میں اس کو دفن کیا گیا۔

مرحوم خالد (فرزند ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں ڈائرکٹر، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز) ایک انتہائی ذہین نوجوان تھا۔ وہ آرکٹیکچر میں زیر تعلیم تھا۔ ہر لحاظ سے وہ ایک صالح اور لائق نوجوان تھا۔ گویا کہ وہ ایک کلی تھی جس کو ابھی پھول بننا باقی تھا۔ مگر اس کے لئے مقدر تھا کہ وہ پھول بننے سے پہلے ہی موجودہ دنیا سے رخصت ہو جائے۔ جمعہ کی نماز کے بعد جب اس کی میت روانہ ہوئی اور میں نے میت کے پلنگ کو کندھا دیا تو میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میری زبان سے نکلا: یہ کیسی عجیب بات ہے کہ بوڑھا دادا نوجوان پوتے کے جنازہ کو کندھا دے رہا ہے۔

مرحوم خالد کی میت جب قبر کے اندر رکھی جا چکی اور حسب قاعدہ میں نے اپنے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس میں مٹی ڈالتے ہوئے کہا: منها خلقناكم وفيها نعيدكم و منها نخرجكم تارةً اخرىٰ۔ تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے قبر سے مرحوم نوجوان کی پر مسرت آواز میرے کانوں میں آرہی ہے: دادا آپ رو رہے ہیں، میں تو دیکھئے، جنت کے باغوں میں کھیل رہا ہوں۔ مرحوم خالد کی وفات کے بعد اگلی رات کو میری لڑکی ڈاکٹر فریدہ نے خواب دیکھا کہ وہ مجھ سے کہہ رہی ہے: ابا دیکھئے خالد تو بول رہے ہیں۔

یہ اسلام کی تعلیم کا کرشمہ تھا۔ اسلام میں بتایا گیا ہے کہ معصوم بچے بلا حساب کتاب جنت میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ مرحوم خالد ابھی معصومیت کی عمر میں تھا، وہ ابھی مسؤلیت کی عمر میں نہیں پہنچا تھا۔ مزید یہ کہ مومن کے لئے حادثہ یا ھدم کی موت کو شہادت کی موت کہا گیا ہے (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب بیان الشہداء) اس بنا پر انشاء اللہ یقینی ہے کہ مرحوم کی موت اس

کے لئے جنت میں داخلہ کا دروازہ تھی۔ ہمارے لئے وہ ایک سوگواری کا دن تھا، مگر مرحوم کے لئے وہ جنت میں داخلہ کا دن۔

یہ انسان کے لئے اسلام کا ایک عظیم تحفہ ہے۔ اسلام کی تعلیمات کا یہ ایک نادر پہلو ہے کہ وہ بدترین مایوسی کے وقت بھی امید کا پیغام دیتا ہے۔ بحران کے سنگین ترین لمحات میں وہ انسان کے لئے سرچشمۂ اعتماد بن جاتا ہے۔ وہ کھونے کی حالت میں بھی پانے کا راز بتاتا ہے۔ ایک غیر اسلامی ذہن جہاں محسوس کرتا ہے کہ اس کی زندگی کا سفر محرومیوں کے ساتھ ختم ہو گیا، وہاں اسلام اپنے وفاداروں کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ نہیں، یہ تمہارے لئے خاتمہ نہیں، بلکہ یہ تمہارے لئے نئے بہتر دور کا آغاز ہے۔ یہ موت نہیں بلکہ زندگی ہے۔ مومن کے لئے محرومی کی ہر کہانی یافت کی کہانی ہے۔ زندگی کے طوفان خیز لمحات میں بھی اللہ کا اعتماد اس کے لئے اتھاہ سہارا ہوتا ہے۔

مومن کی ہر رات ایک نئی صبح کا آغاز ہے۔ مومن کے لئے اس کا ایمان ایک اتھاہ سرچشمۂ اعتماد ہے۔ مایوسی اور محرومی غیر مومن کے لئے ہو سکتی ہے مگر مومن کے لئے اس دنیا میں نہ مایوسی کا سوال ہے اور نہ محرومی کا سوال۔

یہ بات صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس طرح آئی ہے: عجباً لأمر المؤمن ان امره كله له خير، وليس ذلك لأحد الا للمؤمن، ان اصابته سراء شكر فكان خيراً له، و ان اصابته ضراء صبر فكان خيراً له (مشکاۃ المصابیح ۱۴۵۸/۳) یعنی مومن کا معاملہ بڑا عجیب ہے۔ اس کا ہر معاملہ اس کے لئے خیر کا سبب ہوتا ہے۔ اور یہ چیز مومن کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔ اگر اس کو خوشحالی پہنچتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے۔ اس طرح خوش حالی اس کے لئے خیر بن جاتی ہے اور اگر اس کو نقصان پہنچتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے اس طرح نقصان اس کے لئے خیر بن جاتا ہے۔

زندگی ناقابلِ برداشت کو برداشت کرنے کا امتحان ہے، اور اسلام ہمیں وہ طاقت دیتا ہے جس کے ذریعہ ہم اس ناقابلِ برداشت کو برداشت کر سکیں۔

حُسن اخلاق کے نمونے

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: بعثت لاتمم حسن الاخلاق (مؤطا، کتاب حسن الخلق، مسند احمد) یعنی میں اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ میں حسن اخلاق کی تکمیل کروں:

I was sent to set the examples of high morals.

اس حدیث میں تکمیل سے مراد اصول اخلاق کی تکمیل نہیں ہے بلکہ اخلاق کے عملی نمونوں کی تکمیل ہے۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے وہ سب کے سب اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ سیرت کے لوگ تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اس اعتبار سے کم یا زیادہ نہ تھا۔ البتہ پیغمبر اسلام اور دوسرے پیغمبروں میں ایک عملی فرق ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے پیغمبروں کی زندگی میں ہر قسم کے عملی نمونے قائم نہ ہو سکے۔ مگر پیغمبر اسلام کی زندگی ایک پر از واقعات زندگی (eventful life) تھی۔ اس بنا پر یہ ممکن ہوا کہ آپ کی زندگی میں ہر قسم کے پیغمبرانہ نمونے قائم ہوں۔ ان نمونوں کی بے حد اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر پیغمبر اسلام کے ساتھ ایسا ہوا کہ آپ کی بعثت کے وقت کعبہ کی مقدس مسجد میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے مکہ کی ۱۳ سالہ زندگی میں ان بتوں کو نظر انداز کر کے دعوت کا کام کیا۔ اگر پیغمبر اسلام کی زندگی میں ایسا نہ ہوا ہوتا تو اس قسم کی دعوتی روش کے لیے بعد کے لوگوں کے پاس کوئی نمونہ موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح آپ کو مکہ میں بہت زیادہ ستایا گیا۔ حتیٰ کہ آپ کے مخالفین آپ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ مگر آپ نے ٹکراؤ نہیں کیا بلکہ خاموشی کے ساتھ مکہ سے نکل کر مدینہ چلے گئے۔ یہ روش بھی پیغمبر کے نمونہ کے بغیر لوگوں کے لیے قابل قبول نہ ہوتی۔

اسی طرح ہجرت کے بعد حدیبیہ کے مقام پر آپ کے مخالفین نے وہ صورت حال پیدا کر دی جس کو عزت کا سوال (prestige issue) کہا جاتا ہے۔ مگر آپ نے اس معاملہ کو عزت کا سوال نہیں بنایا بلکہ مخالفین کی شرطوں کو یکطرفہ طور پر مان لیا۔ اس معاملہ میں اگر پیغمبر اسلام کا نمونہ قائم نہ ہو گیا ہوتا تو بعد کا کوئی بھی شخص حدیبیہ روش کی ہمت نہ کرتا۔

انسان کا المیہ

قرآن کی سورہ نمبر ۹۰ میں زندگی کی حقیقت کو ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: لقد خلقنا الانسان فی کبد ○ أیحسب أن لن یقدر علیه أحد (البلد ۴-۵) یعنی بے شک ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا وہ گمان رکھتا ہے کہ اس پر کسی کا قابو نہیں چلے گا۔

We have created man into a life of hardship.
Does he think that no one has power over him.

قرآن کی اس آیت میں کبد کا لفظ آیا ہے۔ کبد کے معنی شدت اور مشقت کے ہیں۔ اس میں عمومی قانون کے تحت بتایا گیا ہے کہ انسان کو خدا نے ایسے حالات میں پیدا کیا ہے کہ اس کو اپنی پوری زندگی مشقتوں میں گزارنی پڑے۔ اس کے مطابق، مشقت اور رنج خدا کے تخلیقی منصوبہ کا ایک لازمی حصہ ہے۔ کوئی بھی انسان اس پر قادر نہیں کہ وہ اپنے آپ کو زندگی کے پر مشقت کورس سے گزرنے سے بچا سکے۔

دنیا کی زندگی میں رنج و مشقت قادر مطلق کے تخلیقی منصوبہ کا حصہ ہیں۔ وہ اس لیے ہیں کہ آدمی کو یاد دلایا جائے کہ موجودہ دنیا تمہارے لیے عیش گاہ کے طور پر نہیں بنائی گئی بلکہ وہ امتحان گاہ کے طور پر بنائی گئی ہے۔ موجودہ دنیا اس لیے ہے تاکہ آدمی مختلف احوال سے گزرے۔ انہی احوال کے درمیان یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص جنت کی ابدی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہے یا نہیں۔ جو شخص ان احوال کے دوران صحیح اور مطلوب ردعمل نہ پیش کرے اس کو الگ کر کے جہنم کے کوڑا خانہ میں ڈال دیا جائے۔

موجودہ ترقی یافتہ دنیا میں بھی ''کبد'' کی یہ صورت حال بدستور باقی ہے۔ لیکن خدا کے تخلیقی نقشہ سے بے خبری کی بنا پر لوگ اس کی نوعیت کو سمجھ نہیں پاتے اور غلط ردعمل پیش کر کے اپنے آپ کو خدا کی نظر میں ایسا انسان ثابت کرتے ہیں جو امتحان کے کورس سے گزر امگر وہ اپنے آپ کو کامیاب نہ کر سکا۔

موجودہ زمانہ میں مذکورہ صورت حال کی نسبت سے لوگوں کے جو مختلف ردعمل سامنے آرہے ہیں ان میں سے تین ایسے ہیں جو زیادہ اہم ہیں۔ ان تینوں قسم کے ردعمل کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

ا۔ اس سلسلہ میں ایک ردعمل یہ ہے کہ جو عورت یا مرد زندگی کی فطری ناخوشگواریوں سے دوچار ہوتے ہیں وہ برداشت کو کھو دیتے ہیں اور پھر یا تو دل شکستہ ہو کر رہ جاتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔

مایوسی کی حالت میں اس قسم کے انتہا پسندانہ ردعمل کی دو مثالیں ہندستانی میڈیا میں حال میں سامنے آئی ہیں۔ انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲۲ اگست ۲۰۰۴ میں مشہور ہندستانی صنعت کار گوتم سنگھانیہ کے بارے میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ گوتم سنگھانیہ ایک ہزار کروڑ روپیہ کے بزنس کے مالک ہیں۔ لیکن بعض حادثات کی وجہ سے وہ اتنا زیادہ دل شکستہ ہیں کہ وہ عوام کے سامنے نہیں آتے۔ وہ زیادہ تر اپنے گھر کے اندر رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دولت کسی بھی شخص کو خوشی نہیں دے سکتی:

Money can not make you happy.

اسی طرح بمبئی کی مشہور ماڈل گرل نفیسہ جوزف اپنے کیریر کے عروج پر تھیں۔ مگر صرف ۲۵ سال کی عمر میں انہوں نے اپنے بیڈ روم کے پنکھے میں لٹک کر خودکشی کر لی (ٹائمس آف انڈیا، ۳۰ جولائی ۲۰۰۴)۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے بوائے فرینڈ سے ان کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ نفیسہ جوزف کو مس انڈیا منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ان کو زندگی کے جو تجربات ہوئے ان کی روشنی میں انہوں نے کہا تھا— مشہور ہونا گویا بلبلہ میں رہنا ہے جو کسی بھی لمحہ ٹوٹ سکتا ہے:

Being famous is like living in a bubble that can burst any moment.

دل شکستگی اور خودکشی دونوں ایک ہی نوعیت کی چیزیں ہیں۔ ان دونوں کے درمیان صرف درجہ کا فرق ہے۔ خدا کے نقشہ کے مطابق، یہ دونوں ہی غیر مطلوب ردعمل ہیں۔ یہ مایوسی کی مثالیں ہیں اور مایوسی خدا کے نزدیک حرام ہے۔ زندگی کے امتحان میں وہ باحوصلہ شخص کامیاب قرار پائے گا جو ہر حال

میں خدا سے امید قائم رکھے۔ جو ہر صورت حال کو وقتی سمجھ کر خدا سے ابدی کامیابی کا امیدوار بنا رہے۔ خدا کا عقیدہ آدمی کو یہی اتھاہ حوصلہ عطا کرتا ہے۔

۲۔ موجودہ زمانہ کی ترقیوں نے ''کبد'' کی صورت حال کو ختم نہیں کیا بلکہ اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔ عوام اور خواص دونوں مستقل طور پر ذہنی تناؤ اور دباؤ (stress) میں جینے لگے۔ اس صورت حال نے ایک نئے بزنس کا دروازہ کھول دیا۔ دنیا بھر میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو اپنے آپ کو آرٹ آف ڈی اسٹریسنگ (art of de-stressing) کا ماہر بتاتے ہیں۔ اس موضوع پر ہزاروں کی تعداد میں کتابیں چھپی ہیں اور بڑے بڑے ادارے ہر جگہ کام کر رہے ہیں۔ یہ ڈی اسٹریسنگ کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ مخصوص ٹیکنیک کے ذریعہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ انسان کی سوچ کو معطل کر دیں اور اس طرح انسان کو مصنوعی طور پر ایسا بنا دیں کہ وہ بے فکری کی حالت میں جینے لگے۔

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان کی اندرونی شخصیت ایک پر امن شخصیت ہے۔ یہ دراصل انسان کا مائنڈ ہے جو مختلف سوچ کے ذریعہ آدمی کو پریشانی میں مبتلا کرتا ہے۔ یہی ذہنی تناؤ کا اصل سبب ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ ذہنی سوچ کو احساس کی دنیا سے الگ کر دیا جائے۔ اس موضوع پر کثرت سے کتابیں اور مضامین چھپے ہیں۔ ایک مضمون وہ ہے جو دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا ۱۵ ستمبر ۲۰۰۴ میں چھپا ہے۔ اس کے لکھنے والے اکہارٹ ٹال (Eckhart Tolle) ہیں اور اس کا عنوان ہے سوچ کے عمل کو روک دو:

Stop thinking

یہ بات قابل بحث ہے کہ بے فکری کی یہ مستقل حالت انسان کے اندر پیدا کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ تاہم بالفرض اگر وہ ممکن ہو تو وہ صرف اس قیمت پر ہوگی کہ انسان کو انسانی مرتبہ سے گرا کر اس کو حیوانی سطح پر جینے والا بنا دیا جائے۔ یا پھر وہ ایک قسم کا تخدیری عمل (anesthesia) ہے۔ مگر اس قسم کا حل کوئی حل نہیں۔ انسان کے اندر سوچنے کی صلاحیت ہی اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ جو حل انسان سے اس کی یہ اعلیٰ صلاحیت چھین لے، وہ حل نہیں ہے بلکہ وہ موت ہے۔ یہ جیتے جی اپنے آپ کو ذہنی قبرستان میں دفن کر دینا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کسی تدبیر کو حل کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس مسئلہ کا جو فطری

حل ہے وہ ڈی اسٹریسنگ نہیں ہے بلکہ وہ اسٹریس مینجمنٹ (stress management) ہے۔

۳۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی میں مصیبت کا شکار رہتے ہیں وہ اکثر اپنے آپ کو اس چیز میں مشغول کر لیتے ہیں جس کو انسانی خدمت یا سوشل سروس کہا جاتا ہے۔ یہ گویا غم غلط کرنے کی ایک تدبیر ہے مگر وہ بھی ''کبد'' کی صورت حال کا صحیح اور مطلوب ردعمل نہیں۔

سوشل سروس ایک انسانی خدمت ہے اور اس اعتبار سے وہ بلاشبہہ ایک قابل تعریف عمل ہے۔ مگر زندگی کے بارے میں خدا کے تخلیقی نقشہ کی اہم تر نسبت سے دیکھا جائے تو اس کے اندر ایک غیر مطلوب پہلو چھپا ہوا ہے۔ غور کیجئے کہ جو شخص کسی مصیبت کا تجربہ کرتا ہے اور پھر وہ سوشل سروس میں مشغول ہو جاتا ہے، اس کی نفسیات کیا ہوتی ہے۔ اس کی نفسیات ایک جملہ میں یہ ہوتی ہے کہ — جو کچھ میں نے بھگتا وہ دوسروں کو نہ بھگتنا پڑے:

Let no other suffer what I have suffered.

یہ نفسیات بتاتی ہے کہ آدمی سارے معاملہ کو بس دنیا کا معاملہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک مصیبت صرف دنیا کی مصیبت ہے اور سب سے بڑا کام یہ ہے کہ دنیا کو بے مصیبت جگہ بنایا جائے۔ حالاں کہ یہ سوچ خدا کے تخلیقی نقشہ کے خلاف ہے، اس لیے وہ یہاں واقعہ بننے والی ہی نہیں۔

جب بھی دنیا میں کسی کو کوئی ناخوشگوار تجربہ ہو تو وہ اس لیے ہوتا ہے کہ آدمی اس سے صحیح سبق لے۔ وہ اس حقیقت کو یاد کرے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں کسی کو بھی آرام کی زندگی ملنے والی نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ دنیا کے منفی تجربات سے آخرت کا سبق لے۔ وہ اپنے اندر اس شعور کو جگائے کہ اس محدود دنیا میں مجھے اپنی مطلوب زندگی ملنے والی نہیں۔ مجھے اپنی مطلوب زندگی آخرت کی لامحدود دنیا میں تلاش کرنی چاہیے۔

ایسی حالت میں ناخوشگوار تجربات کا صحیح سبق یہ ہے کہ آدمی آخرت کی جنت کو یاد کرے، وہ اپنے اندر اس سوچ کو بیدار کرے کہ — جو کچھ میں نے آج کی عارضی دنیا میں بھگتا وہ مجھے کل کی ابدی دنیا میں نہ بھگتنا پڑے:

Let me not suffer in the Hereafter that
which I have suffered in this world.

کامیاب وہ ہے جس نے عارضی دنیا میں ابدی دنیا کو پہچانا۔ جس نے موجودہ دنیا کی ناکامی میں آخرت کی ابدی کامیابی کا راز دریافت کرلیا۔

قرآن میں ایک طرف بتایا گیا ہے کہ خدا نے موجودہ دنیا کو ایک ایسے نقشہ کے مطابق بنایا ہے کہ یہاں ہر عورت اور مرد کبد (مشقت) میں رہے۔ دوسری طرف قرآن میں بتایا گیا ہے کہ موت کے بعد آنے والی دوسری دنیا حزن (فاطر ۳۴) سے پاک ہوگی جو صرف خدا کے پسندیدہ لوگوں کو ملے گی۔ زندگی کے بارے میں یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مذکورہ قسم کے تمام مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اس تخلیقی تقسیم کی روشنی میں دیکھئے تو تمام انسانی مسائل کی جڑ یہ ہے کہ لوگ موت سے پہلے کی دنیا میں اپنی جنت بنانا چاہتے ہیں جب کہ یہاں خالق نے وہ حالات ہی نہیں رکھے کہ یہاں کوئی شخص اپنی جنت بنا سکے۔ جس طرح ریت یا دلدل کے اوپر کوئی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی ہے اسی طرح موجودہ دنیا میں کسی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ یہاں اپنا عیش محل تعمیر کرسکے۔ اور جب فطری قانون کے تحت آدمی اس ناکامی سے دوچار ہوتا ہے تو وہ مختلف قسم کے منفی ردعمل کا شکار ہوکر اپنے کو مزید تباہی میں ڈال لیتا ہے۔

صحیح یہ ہے کہ آدمی اس تخلیقی قانون کا اعتراف کرے اور اس کے مطابق، وہ اپنی زندگی کا منصوبہ بنائے۔ یہ منصوبہ صرف ایک ہے — موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو وہ مطلوب انسان بنانا جو موت کے بعد کی دنیا میں جنت میں داخلہ کا مستحق قرار پائے۔ خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، موت سے پہلے کی دنیا میں انسان کے لیے قناعت ہے، اور موت کے بعد کی دنیا میں انسان کے لیے جنت۔ دور قناعت میں جنت نہیں، اور دور جنت میں قناعت نہیں۔

خدا اور آخرت

تخلیق اپنے آپ میں خالق کا ثبوت ہے۔ کائنات اتنا زیادہ بامعنی واقعہ ہے کہ یہ ناقابل تصور ہے کہ کسی کے بنائے بغیر وہ بن گئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہمارے لیے چوائس باخدا کائنات اور بے خدا کائنات میں نہیں ہے بلکہ حقیقی انتخاب باخدا کائنات یا غیر موجود کائنات میں ہے۔ کیوں کہ اگر ہم خدا کے وجود کو نہ مانیں تو ہمیں خود کائنات کو غیر موجود ماننا پڑے گا۔ اور ہمارے لیے ایسا چوائس سرے سے ممکن ہی نہیں۔

The choice for us in this regard is not between universe with God or universe without God. This is not the choice. The real choice is between universe with God or no universe at all. If we say that God does not exist then we are also compelled to say that the universe does not exist. But the universe is too obvious a fact that we are not in a position to deny the existence of the universe. So we can not deny the existence of God.

بامعنی کائنات

سر جیمس جنیز نے کہا تھا کہ کائنات کا خالق ایک ریاضیاتی دماغ (mathematical mind) ہے۔ میں کہوں گا کہ ہماری دنیا اتنی زیادہ بامعنی ہے کہ وہ اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا خالق معنویت کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ ایسا خالق ایک ایسی دنیا کی تخلیق نہیں کر سکتا جو اپنے انجام کے اعتبار سے ناقص ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک بامعنی خالق ایک بے معنی کائنات کی تخلیق کرے۔ کائنات اپنی ساری معنویت کے باوجود اپنی موجودہ حالت میں ناقص ہے۔ وہ اپنی تکمیل کے لیے ایک اور دنیا کی طالب ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جس کو پیغمبروں نے آخرت کی دنیا کہا ہے۔

یہ آخرت کی دنیا صرف عقیدہ کی بات نہیں۔ وہ پوری طرح ایک علمی واقعہ ہے۔ عالم آخرت

کے وجود کو ٹھیک اسی علمی معیار پر ثابت کیا جا سکتا ہے جس معیار پر سائنس میں دوسری تمام چیزوں کو ثابت کیا جاتا ہے۔

سائنسی ثبوت

اس معاملہ میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ سائنٹفک پروف کیا ہے۔ موجودہ سائنس کے مطابق، سائنٹفک پروف یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کے معاملہ میں تیقن (certainty) کا درجہ حاصل ہو جائے۔ اس قسم کا ناقابلِ انکار تیقن کسی بھی چیز کے بارے میں ممکن نہیں۔ جدید سائنسی موقف کے مطابق، کسی چیز کا علمی طور پر ثابت ہو جانا یہ ہے کہ اس کا قرینہ یا امکان (probability) ثابت ہو جائے۔ جدید سائنس میں جن نظریات کو مسلّمہ کے طور پر مانا جاتا ہے ان کو صرف اس لیے مانا جاتا ہے کہ ان کا امکان ثابت ہو گیا نہ یہ کہ مشاہداتی سطح پر ان کے واقع ہونے کا قطعی علم حاصل ہو گیا ہے۔ ایٹم کے اسٹرکچر کو بطور حقیقت ماننا اسی نوعیت کی ایک مثال ہے۔

عالم آخرت کے وجود کو ماننے کے لیے بھی ہمیں اسی مسلّمہ سائنٹفک متھڈ کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس کے سوا کسی دوسرے متھڈ کو استعمال کرنا اصولی طور پر درست نہیں۔ کیوں کہ علمی طور پر ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ دوسرے معاملات میں جس سائنٹفک متھڈ کو ہم معقول (valid) مانیں، عالم آخرت کے بارے میں ہم اس متھڈ کے استعمال سے انکار کر دیں۔

تین علمی اصول

جیسا کہ معلوم ہے، اس طرح کے معاملہ میں تین علمی اصول سائنٹفک متھڈ کے تین اجزاء ہیں۔ وہ اجزاء یہ ہیں — مفروضہ، مشاہدہ، اور تصدیق:

Hypothesis. Observation, Verification

اس سہ نکاتی فارمولا کو عالم آخرت کے وجود کے معاملہ میں استعمال کیا جائے تو ہم یقینی طور پر ایک موافق قرینہ یا ایک تائیدی امکان تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا، قرینہ یا امکان تک پہنچنے ہی کا دوسرا نام تیقن (certainty) ہے۔

اس موضوع کا مطالعہ کرتے ہوئے پہلا قرینہ یہ سامنے آتا ہے کہ انسان دوسری تمام مخلوقات سے مختلف ہے۔ یہ انسان کی ایک استثنائی صفت ہے کہ وہ کل (tomorrow) کا تصور رکھتا ہے۔ انسان کے سوا جمادات اور نباتات اور حیوانات میں سے کوئی بھی نہیں جو اپنے اندر کل کا تصور رکھتا ہو۔ اس مشاہدہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے سوا دوسری تمام مخلوقات کی منزل صرف آج ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کی منزل آئندہ آنے والے کل (tomorrow) سے تعلق رکھتی ہے۔

انسانی جسم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان کا جسم ان گنت خلیوں (living cells) سے بنا ہے۔ یہ خلیے ہر لمحہ ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اس طرح انسان کا جسم بار بار پرانے کے بعد نیا ہوتا رہتا ہے جیسا کہ بہتے ہوئے دریا کا پانی ہر وقت پرانا اور نیا ہوتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی شخصیت اس کے جسم سے الگ ایک مستقل وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسم پر موت واقع ہوتی ہے مگر اس کی روحانی شخصیت بدستور باقی رہتی ہے۔

اسی طرح ہر انسان کے اندر نہایت گہری خواہشیں موجود ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان خواہشات کو طلب کرنے والا ایک حیوان ہے:

Man is a desire-seeking animal.

مگر اسی کے ساتھ تجربہ بتاتا ہے کہ کسی بھی انسان کی یہ خواہشیں پوری نہیں ہوتیں۔ ہر انسان اپنی خواہشات کے مطابق اپنے لیے ایک معیاری دنیا بنانا چاہتا ہے مگر ہر انسان جلد ہی مر جاتا ہے، اس سے پہلے کہ اس نے اپنی خواہشوں کے مطابق اپنا مطلوب کل بنایا ہو۔

امید کی کرن

امریکی مشنری بلی گرہم نے لکھا ہے کہ اس کو ایک بار ایک امریکی دولت مند کا ارجنٹ پیغام ملا۔ اس پیغام میں کہا گیا تھا کہ مجھ سے فوراً ملو۔ بلی گرہم نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔ وہ فوراً سفر کر کے مذکورہ امریکی دولت مند کے پاس پہنچا۔ بلی گرہم کا بیان ہے کہ جب میں امریکی دولت مند کے گھر پہنچا تو وہ فوراً مجھ کو اپنے وسیع مکان کے ایک الگ کمرہ میں لے گیا۔ یہاں ہم دونوں دو کرسیوں پر آمنے

سامنے بیٹھے۔ اس کے بعد امریکی دولت مند نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ بلی گرہم سے کہا کہ دیکھو، میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ زندگی اپنی ساری معنویت کھو چکی ہے۔ میں نامعلوم کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان، کیا تم مجھے امید کی ایک کرن دے سکتے ہو:

You see, I am an old man. Life has lost all meaning. I am going to take a fateful leap into the unknown. Young man can you give me a ray of hope.

یہ سوال صرف ایک امریکی دولت مند کا سوال نہیں۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر آدمی اس سوال سے دوچار ہوتا ہے، عورت بھی اور مرد بھی۔ اس سوال کا معقول جواب صرف عالم آخرت کے عقیدہ میں ملتا ہے۔ اگر موت کے بعد ایک اور دنیا کو نہ مانا جائے تو یہ عالمگیر سوال ہمیشہ کے لیے بے جواب ہو کر رہ جائے گا۔

تضاد کا خاتمہ

انسان کے بارے میں اس قسم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد پیدائشی طور پر دو متضاد صفات رکھتے ہیں۔ ایک طرف ہر ایک کی بے پناہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی ایک مطلوب دنیا (dream world) بنائے، ایک ایسی دنیا جو اس کے آئیڈیل کے مطابق ہو اور جہاں وہ اپنے ''کل'' کے دور حیات کو خوشیوں اور راحتوں کے ساتھ گزار سکے۔ مگر دوسری طرف ہر انسان اس تضاد میں مبتلا ہے کہ وہ بظاہر تمام مادی چیزیں حاصل کر لینے کے باوجود اپنی مطلوب دنیا بنا نہیں پاتا۔ بورڈم، نقصان، بیماری، ایکسیڈنٹ، بوڑھاپا اور آخر میں سو سال سے بھی کم مدت میں موت، یہی اس دنیا میں انسان کی کہانی ہے۔

یہی معاملہ ہر عورت اور ہر مرد کا ہے۔ ہر ایک اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل کا تصور بسا ہوا ہوتا ہے۔ مگر ہر ایک اپنی حسین تمناؤں کو لیے ہوئے مر جاتا ہے، قبل اس کے کہ اس نے اپنی مطلوب دنیا کو عملاً پایا ہو۔

یہاں دوبارہ ایک مشاہدہ سامنے آتا ہے۔ یہ مشاہدہ کی دنیا میں عالمگیر طور پر زوجین (pairs)

کا اصول قائم ہے۔ یہاں ہر چیز جوڑے جوڑے کی صورت میں ہے۔ ہر چیز دو کے ملنے سے مکمل ہوتی ہے—ایٹم میں نگیٹیو پارٹیکل اور پازیٹیو پارٹیکل، ستاروں کی دنیا میں جوڑا ستارے (pair stars)، نباتات کی دنیا میں نر اور مادہ، حیوانات کی دنیا میں مذکر اور مؤنث، انسان کی دنیا میں مرد اور عورت۔

اس عالمگیر فطری اصول کو زوجین کا اصول (pair principle) کہا جا سکتا ہے۔ یہ اصول بتاتا ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے آپ کو مکمل کرتی ہے۔ اسی عالمگیر اصول میں مذکورہ سوال کا جواب ہے۔ اس کے مطابق، ساری دنیا میں ایک جوڑا دنیا (pair world) ہے۔ موجودہ دنیا کے ساتھ ایک اور دنیا موجود ہے اور اسی دنیا کے ملنے سے ہی موجودہ دنیا اپنے وجود کو مکمل کرتی ہے۔

آغاز کی تکمیل

اب مذکورہ مشاہدہ کی روشنی میں دیکھئے تو اس بات کی واضح تصدیق ہو جاتی ہے کہ عالم آخرت کا نظریہ درست ہے۔ عالم آخرت وہ جوڑا دنیا ہے جس کے ملنے سے موجودہ دنیا اپنے وجود کی تکمیل کرتی ہے۔ اس جوڑا دنیا سے ملے بغیر ہماری موجودہ دنیا اسی طرح نامکمل ہو جاتی ہے جس طرح اس کائنات کی دوسری تمام چیزیں اپنے جوڑے کے بغیر نامکمل رہتی ہیں۔

ہماری دنیا کا دو دنیاؤں کی صورت میں ہونا بہت بامعنی ہے۔ اس دوسری دنیا کو ماننے کے بعد انسانی وجود ایک مکمل وجود بن جاتا ہے۔ اب ہر چیز اپنی معنویت پالیتی ہے۔ اب ہر چیز اپنے خانہ میں فٹ بیٹھ جاتی ہے:

Everything falls into place.

درست فریم ورک

یہ تصور ہم کو وہ فریم ورک دے دیتا ہے جس میں زندگی اور کائنات کی ہر چیز اپنی اطمینان بخش توجیہہ پا سکے۔ اس تصور سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جنت اور جہنم کیا ہے۔ جنت گویا سنجیدہ اور حق پرست لوگوں کی آرام گاہ ہے اور جہنم گویا سرکش اور باطل پرستوں کا عذاب خانہ۔

اس کے مطابق جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا کو عالم امتحان (testing ground)

کے طور پر بنایا گیا اور اگلی دنیا کو اپنا انجام پانے کی جگہ کے طور پر تخلیق کیا گیا۔ انسان کو پیدائشی طور پر ابدی مخلوق کی حیثیت سے بنایا گیا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو ہمیشہ زندہ رہنے والی شخصیت عطا ہوئی ہے۔ تاہم انسان کی زندگی گویا آئس برگ کی مانند ہے جس کا بہت چھوٹا حصہ اوپر دکھائی دیتا ہے اور اس کا پورا بقیہ وجود سمندر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی مدت عمر (life span) دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کا بہت چھوٹا حصہ موجودہ دنیا میں رکھا گیا ہے اور اس کی مدت حیات کا زیادہ بڑا حصہ عالم آخرت میں رکھ دیا گیا ہے۔

موجودہ دنیا کی ہر چیز انسان کے لیے امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز اس لیے ہے تاکہ انسان اپنی شخصیت کو مکمل کرے۔ مثال کے طور پر موجودہ دنیا طرح طرح کی تلخیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ انسان ان تجربات سے گزرتے ہوئے یہ ثبوت دے کہ وہ منفی حالات میں بھی مثبت احساسات کے ساتھ جی سکتا ہے۔ ایسے ہی مثبت شخصیات کے لوگ جنت کی معیاری دنیا میں داخل کئے جائیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ ردعمل کا شکار ہو گئے اور منفی تجربات کے درمیان خود بھی منفی بن گئے، ایسی منفی شخصیت رکھنے والے لوگوں کو جنت کے لیے نااہل قرار دیا جائے گا۔ وہ جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے جہاں سے وہ کبھی نکل نہ سکیں گے۔

عضویاتی ارتقاء کے نظریہ کو موجودہ زمانہ میں سائنٹفک فیکٹ سمجھا جاتا ہے۔ ایسا اس لیے نہیں ہے کہ عضویاتی ارتقاء کے نظریہ کے حق میں مشاہداتی دلائل حاصل ہو گئے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ نظریہ ارتقاء کو ماننے کی صورت میں حیاتیاتی شواہد کی ایک قابل فہم توجیہہ حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کہ علماء سائنس کے نزدیک، دوسرا کوئی ایسا نظریہ موجود نہیں جو معلوم حیاتیاتی شواہد کی توجیہہ کرتا ہو۔ گویا نظریہ ارتقاء ایک قابل عمل نظریہ (workable theory) ہے نہ کہ معروف معنوں میں کوئی ثابت شدہ نظریہ (proved theory)۔

اطمینان بخش توجیہہ

اس سائنسی اصول کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں تمام معلوم

شواہد کی تشفی بخش توجیہہ مل جاتی ہے، جب کہ عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں سب کچھ ناقابل توجیہہ بنا رہتا ہے۔

عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا ادھوری معلوم ہوتی ہے، جب کہ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا مکمل نظر آنے لگتی ہے۔ عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں یہ بات ناقابل فہم بنی رہتی ہے کہ بہت سے سچے اور اچھے انسان دنیا سے اس طرح چلے گئے کہ انہیں اپنی سچائی کا کوئی انعام نہیں ملا۔ مگر عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں یہ اشکال پوری طرح ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں موجودہ دنیا کا یہ واقعہ ناقابل توجیہہ بنا رہتا ہے کہ یہاں کیوں ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ برائی اور سرکشی کرتے ہیں مگر یہاں وہ اپنی برائی کی سزا نہیں پاتے۔ مگر عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں ہم کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے۔

اسی طرح عالم آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں یہ بات مکمل طور پر ناقابل فہم رہتی ہے کہ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ انسان یہاں ایک آئیڈیل ورلڈ کا تصور لے کر پیدا ہوتا ہے، مگر ہر شخص اس آئیڈیل ورلڈ کو پائے بغیر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ عالم آخرت کو ماننے کی صورت میں یہ اشکال مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اب انسان اس یقین کے ساتھ موجودہ دنیا میں رہ سکتا ہے کہ جس مطلوب چیز کو وہ قبل از موت دنیا میں نہ پا سکا وہ اس کو بعد از موت دنیا میں پالے گا۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی چیز عبث پیدا نہیں کی گئی۔ سورج چاند کا نظام ہو یا زمین کے کیڑے مکوڑے سب ایک مقصد کے تحت پیدا کئے گئے ہیں اور وہ اپنے اس مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اس حالت میں اس دنیا میں صرف ایک ہی چیز ایسی ہے جو بظاہر بلا مقصد معلوم ہوتی ہے۔ ہر عورت اور مرد کے اندر پیدائشی طور پر حسین تمناؤں کا ایک تصور بسا ہوا ہے، کوئی بھی عورت یا مرد اس سے خالی نہیں۔ پھر جب اس دنیا کی دوسری تمام چیزیں واضح مقصد کے تحت پیدا کی گئی ہیں تو یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کی خواہشیں اور تمنائیں بھی اپنی ایک حقیقی منزل رکھتی ہوں۔ جس کائنات میں ہر چیز بامقصد ہو وہاں انسان کی خواہشیں اور تمنائیں بے مقصد نہیں ہو سکتیں۔

یقینی طور پر یہ خواہشیں اور تمنائیں بھی سوچی سمجھی تخلیق ہیں۔ ان کی پیدائش کا ایک واضح مقصد ہے۔ البتہ یہ مقصد موجودہ محدود دنیا میں پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ خواہشیں اور تمنائیں لامحدود ہیں اور وہ ایک لامحدود دنیا ہی میں پوری ہوسکتی ہیں۔ اسی لامحدود دنیا کا نام آخرت ہے۔

آخرت کی اس لامحدود دنیا میں اچھے لوگوں کو ابدی جنت ملے گی جو ہر قسم کی خوشیوں اور راحتوں سے بھری ہوئی ہوگی۔ اس کے برعکس جو لوگ موجودہ دنیا میں برے ثابت ہوں ان کو آخرت کی دنیا میں جہنم میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ مجبور ہوں گے کہ وہ اپنی برائیوں کی سزا ابدی طور پر بھگتتے رہیں۔

جنت کی حقیقت

جنت کیا ہے۔ جنت انسان کی تلاش کا جواب ہے۔ انسان اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں وہ ایک انوکھے استثناء کی حیثیت رکھتا ہے۔ وسیع کائنات کا ہر جزء اپنے آپ میں مکمل ہے۔ یہاں صرف انسان ہے جو اپنے آپ میں مکمل نہیں۔ پوری کائنات ایک بے نقص (zero-defect) کائنات ہے۔ یہاں صرف انسان ہے جو استثنائی طور پر ناقص وجود کی حیثیت رکھتا ہے۔

کائنات میں ہر طرف یقین (certainty) ہے اور انسان کی دنیا میں غیر یقینیت (uncertainty)۔ بقیہ کائنات میں کہیں خوف (fear) دکھائی نہیں دیتا مگر انسان ہمیشہ خوف اور اندیشہ سے دوچار رہتا ہے۔ بقیہ کائنات میں ہر طرف تسکین (satisfaction) کی حالت ہے اور انسان کی زندگی میں بے تسکینی (dissatisfaction) کی حالت ہے۔ بقیہ کائنات میں ہر چیز کا حال یہ ہے کہ جو کچھ اس کو چاہئے وہ سب اس کو مل رہا ہے مگر انسان اس دنیا کی واحد مخلوق ہے جو اسی احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ جو کچھ اس نے چاہا وہ اس کو نہیں ملا۔ بقیہ کائنات ایک برائی سے پاک (evil-free) کائنات ہے۔ مگر انسان استثنائی طور پر اس مسئلہ سے دوچار ہے جس کو برائی کا مسئلہ (problem of evil) کہا جاتا ہے۔

جنت اسی سوال کا جواب ہے۔ جنت کا تصور بتاتا ہے کہ انسان کے لیے بھی وہ سب کچھ پوری

طرح موجود ہے جو بقیہ کائنات کو ملا ہوا ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ بقیہ کائنات کو اپنا مطلوب آج میں مل رہا ہے، جب کہ انسان کو اس کا مطلوب کل میں ملے گا۔ دونوں کے معاملات کا یہی فرق ہے جس کی بنا پر ایسا ہے کہ بقیہ کائنات کے پاس کل (tomorrow) کا تصور نہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو استثنائی طور پر کل کے تصور میں جیتا ہے۔

فطرت کا حصہ

خدا اور آخرت کا معاملہ بظاہر غیر مشہود دنیا (unseen world) سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرت انسانی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ انسان کی فطرت خدا اور آخرت کے معاملہ کو ایک معلوم صداقت کے طور پر جان لیتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی معرفت کے دو درجے ہیں۔ ایک عقلی اور دوسرا فطری۔ خدا اور آخرت کے وجود کو عقلی سطح پر ماننا اس معرفت کا صرف ابتدائی درجہ ہے جب کہ خدا اور آخرت کے وجود پر فطری سطح پر یقین کرنا اس کا انتہائی درجہ۔ خدا اور آخرت کے معاملہ میں عقلی دلائل کے استعمال کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر سے شک کے پردے کو ہٹا دیا جائے۔ انسان کو اس مقام تک لایا جائے جہاں وہ خدا اور آخرت کے معاملہ کو کم از کم امکانی صداقت کے طور پر قبول کر لے۔

خدا اور آخرت کے معاملہ میں دلیل اور منطق کے استعمال کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو اس فکری سطح پر لایا جائے جہاں وہ خدا اور آخرت کے وجود کو بطور ایک نظریہ ماننے کے لیے تیار ہو جائے۔ جب آدمی اس حالت تک پہنچ جائے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس نظریہ کو لینے کے لیے اس کی فطرت کے دروازے کھل جائیں۔ وہ اس کو ایک فطری سچائی کے طور پر پہچان کر اپنا لے۔

ہر انسان کے پاس وہ آنکھ موجود ہے جو خدا اور آخرت کو دیکھ سکے مگر اس آنکھ کے اوپر کنڈیشننگ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ منطقی دلیل یہ کام کرتی ہے کہ وہ اس کنڈیشننگ یا اس ذہنی رکاوٹ (mental block) کو توڑ کر اس مصنوعی پردہ کو فطرت کی آنکھ سے ہٹا دے۔ اس کے بعد انسان خدا اور آخرت کو صاف دیکھنے لگتا ہے۔ اب انسان بظاہر نہ دکھائی دینے والے خدا کے وجود پر

اسی طرح کامل یقین کر لیتا ہے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کے وجود پر کامل یقین رکھتا ہے۔ حالاں کہ اس نے کبھی اپنے آپ کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔

خدا اور آخرت کا معاملہ صرف اس وقت تک منطقی بحث کا موضوع رہتا ہے جب تک کہ آدمی کے ذہن کا مصنوعی پردہ ہٹا نہ ہو۔ غور وفکر یا منطقی استدلال کے ذریعہ جب یہ پردہ ہٹ جائے تو انسان اپنے خدا کو خود اپنی داخلی معرفت کے تحت پہچان لیتا ہے۔ اب خدا اس کے لیے تمام معلوم چیزوں سے زیادہ معلوم واقعہ بن جاتا ہے۔ منطقی دلیل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ انسان کو فطرت کے دروازے تک پہنچا دے۔ فطرت کا دروازہ کھلتے ہی انسان خدا کو اس طرح پالیتا ہے جیسے کہ وہ پہلے ہی سے اس کو جانتا تھا۔

انسان کی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہو تو ضرورت ہوتی ہے کہ سورج کے وجود کو اس کے لیے دلائل سے ثابت کیا جائے۔ لیکن جب آنکھ کی پٹی ہٹا دی جائے تو اس کے بعد سورج کو ماننے کے لیے اسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ خدا کا ہے۔ خدا کا شعور انسان کی فطرت میں آخری حد تک سمایا ہوا ہے۔ اصل ضرورت صرف فطرت کا پردہ ہٹانے کی ہے۔ دلیل کے ذریعہ جب فطرت کا پردہ ہٹا دیا جائے تو انسان خدا کو اس سے بھی زیادہ یقین کے ساتھ دیکھنے لگتا ہے جتنا کہ ایک کھلی آنکھ والا انسان آفتاب کو۔

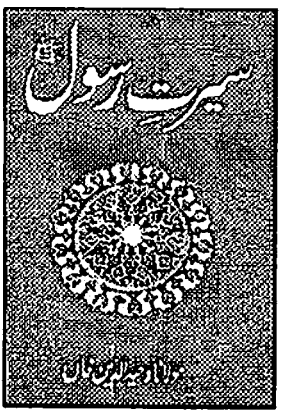

یہ کتاب سیرتِ رسول کا ایک سادہ اور واقعاتی مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں پیغمبر اسلام کی زندگی کو تاریخ وار انداز میں کسی تشریح یا تعبیر کے بغیر بیان کیا گیا ہے۔ یہ پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی کی ایک تاریخی تصویر ہے۔ یہ معلوماتی اُسلوب میں سیرتِ رسول کا ایک جامع تعارف ہے۔ پوری کتاب اسی بیانیہ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔

دنیا اور آخرت

بیج ڈالنے کے دن جو کسان فصل کاٹنا چاہے، وہ بیج کو بھی کھوئے گا اور فصل سے بھی محروم رہے گا۔ یہی معاملہ دنیا اور آخرت کا ہے۔ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور آخرت اس کا انعام پانے کی جگہ۔ جو شخص دنیا ہی میں ''انعام'' حاصل کرنا چاہے تو وہ اس قیمت پر ہوگا کہ وہ مطلوب عمل انجام نہ دے سکے گا۔ وہ آخرت کی تعمیر کے واحد موقع کو کھو دے گا۔

جو چیز جنت میں ملنے والی ہے اس کو آدمی موجودہ دنیا میں پانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دونوں ہی کو کھو دیتا ہے۔ عقل مند انسان وہ ہے جو دنیا کے ذریعہ آخرت کو خریدے، نہ کہ دنیا میں پھنس کر اپنے آپ کو آخرت سے محروم کرلے۔

آپ سفر کے دوران وہ سکون حاصل کرنا چاہیں جو صرف گھر پر کسی آدمی کو ملتا ہے تو آپ کبھی اپنی اس طلب میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی مثال سے دنیا اور آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ دنیا کو خدا نے عمل کرنے کی جگہ بنایا ہے اور آخرت کو عمل کا انجام پانے کی جگہ۔ یا دنیا سفر کا راستہ ہے اور آخرت اس کی منزل۔

اب اگر آپ چاہیں کہ دنیا ہی میں اپنا انجام پالیں تو آپ کے عمل کی منصوبہ بندی بالکل غلط ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر آپ راستہ میں منزل والا سکون حاصل کرنا چاہیں تو آپ اپنے راستہ کو کھونا کر لیں گے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو دنیا اور آخرت کے اس فرق کو سمجھے۔ وہ موت سے پہلے اس چیز کی خواہش نہ کرے جو صرف موت کے بعد والی زندگی میں کسی کو مل سکتی ہے۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ حقیقت پسند بنے۔ وہ خواہشوں کے پیچھے نہ دوڑے۔ کیوں کہ خواہشیں آدمی کو گڑھے کے سوا کسی اور منزل پر پہنچانے والی نہیں۔

ہر آدمی اپنے سینہ میں خواہشات کا ایک سمندر لئے ہوئے ہے۔ یہ خواہشات بجائے خود غلط نہیں۔ مگر ان خواہشات کی تکمیل کا مقام آخرت ہے نہ کہ موجودہ دنیا۔

عاجلانہ اقدام

عاجلانہ اقدام ہر ایک کے لیے تباہ کن اقدام ہے۔ خواہ فرد کا معاملہ ہو یا جماعت کا معاملہ، کسی کے لیے بھی عاجلانہ اقدام مفید نہیں ہوسکتا۔ عاجلانہ اقدام دراصل اندھیرے میں چھلانگ کے ہم معنی ہے، اور کوئی بھی شخص اتنا طاقتور نہیں کہ وہ اندھیرے میں چھلانگ لگائے اور پھر اُس کے نتائج وعواقب سے اپنے کو بچالے۔

ایک صاحب تھے۔ وہ کریلا سے چڑھتے تھے۔ اُن کے سامنے کوئی کریلا کا نام لے لے تو وہ بگڑ کر اُس کو بُرا بھلا کہنے لگتے تھے۔ اُن کو غصہ دلانے کے لیے اتنا کافی تھا کہ کوئی شخص اُن کے سامنے کریلا کا لفظ بول دے۔ چند لڑکوں کو خیال آیا کہ وہ مذکورہ صاحب کو چڑھائیں۔ وہ اُن کے پاس گئے۔ ہر لڑکے نے باری باری ایسا کیا کہ وہ ہاتھ سے ان کی طرف اشارہ کرتا اور کہتا— کریلا۔

مذکورہ صاحب اس پر سخت غصہ ہوئے۔ وہ اپنا ڈنڈا لے کر ان لڑکوں کی طرف دوڑے کہ انہیں ماریں۔ لڑکے تیزی سے بھاگنے لگے۔ اب صورت یہ تھی کہ لڑکے آگے بھاگ رہے ہیں اور مذکورہ صاحب اُن کے پیچھے لاٹھی لیے ہوئے دوڑ رہے ہیں۔ اس عمل کے دوران مذکورہ صاحب کی توجہ مکمل طور پر لڑکوں کی طرف لگی ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نیچے زمین کی طرف نہ دیکھ سکے۔ راستہ میں ایک مین ہول تھا جس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ مذکورہ صاحب مین ہول کو نہ دیکھ سکے۔ وہ دوڑتے ہوئے اس کے اندر گر گئے۔ اُن کا ایک پاؤں ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد اُن کا پاؤں کبھی ٹھیک نہ ہوسکا۔ چنانچہ وہ ساری عمر لاٹھی لے کر چلتے رہے۔

یہ کہانی کسی ایک فرد کی کہانی نہیں۔ اکثر لوگ کسی نہ کسی طور پر اس قسم کی غلطی کرتے ہیں اور پھر ساری زندگی افسوس کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غصہ ایک لمحہ میں ٹھنڈا ہوسکتا ہے، لیکن غصہ کا برا انجام ساری عمر بھگتنا پڑتا ہے۔ وقتی طور پر ایک ناخوش گوار چیز کو برداشت کر لیجیے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ کو ساری عمر ناخوش گوار چیزوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔

وقت کی پابندی

ایک اسکول کے ٹیچر کا واقعہ ہے۔ اُن کا گھر اسکول سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ اُن کا معمول تھا کہ وہ گھر سے اسکول تک کا یہ فاصلہ رکشہ کے ذریعہ طے کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے اُنہوں نے ایک رکشہ والے سے معاملہ طے کر رکھا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ رکشہ والا چند منٹ دیر سے پہنچا۔ مذکورہ ٹیچر وقت پر اپنے گھر سے نکلے اور جب اُنہوں نے رکشہ والے کو نہیں دیکھا تو انہوں نے طے کیا کہ وہ دوڑتے ہوئے اپنے اسکول جائیں گے۔ چنانچہ وقت پر اپنے گھر سے نکل کر دوڑتے ہوئے وہ اپنے اسکول کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد رکشہ والا آیا۔ وہ تیزی سے رکشہ چلاتا ہوا ٹیچر کے پاس پہنچا اور کہا کہ آیئے رکشہ پر بیٹھ جایئے۔ مگر ٹیچر بدستور دوڑتے رہے۔ وہ آگے چل رہے تھے اور رکشہ اُن کے پیچھے۔ اسی حال میں چلتے ہوئے وہ اسکول پہنچے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رکشہ والے نے دوبارہ کبھی تاخیر نہ کی۔

وقت کی پابندی اتنی زیادہ اہم ہے کہ جس آدمی کے اندر وقت کی پابندی کی صفت نہ ہو وہ کبھی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں اصل ضرورت یہ ہے کہ آدمی وقت کے بارہ میں حساس ہو۔ وقت کو ضائع کرنے والے وہی لوگ ہیں جو وقت کے بارہ میں حساس نہ ہوں۔ جو آدمی وقت کی اہمیت کو جانتا ہو وہ اس معاملہ میں کبھی کوئی عذر پیش نہیں کرے گا۔ وہ ہر صورت حال میں اپنے وقت کو منظم کرنے میں کامیاب رہے گا۔ وقت کی پابندی کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ ملے ہوئے وقت کو بھرپور طور پر استعمال کیا جائے۔

بعض لوگ وقت کی تنگی کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ بے معنی عذر ہے۔ اصل مسئلہ وقت کی تنگی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ سوچ کی تنگی ہے۔ جس آدمی کا شعور اس معاملہ میں زندہ ہو وہ اپنے اوقات کی تنظیم اس طرح کرے گا کہ وہ کم وقت میں بھی زیادہ کام کر سکے۔ اسی حقیقت کو اسماعیل میرٹھی نے اپنے شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

وقت میں تنگی فراخی دونوں ہیں جیسے ربڑ کھینچنے سے بڑھتی ہے، چھوڑے سے جاتی ہے سکڑ

اپنے کام سے کام

تقریباً پانچ سال پہلے دہلی میں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان سے ہوئی۔ اُنہوں نے کمپیوٹر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اُن کے دورشتہ داروں کے ساتھ میں اُن کے گھر پر ملا۔ اُس وقت وہ ایک سرکاری ملازمت کررہے تھے۔ ہم لوگ تقریباً ایک گھنٹہ تک وہاں رہے۔ اس پورے وقت میں میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ نوجوان نہ صرف اپنے فن میں ایکسپرٹ ہے بلکہ اُس کے اندر ایک انوکھی صفت ہے۔ اس صفت کو ایک لفظ میں کہہ سکتے ہیں، اپنے کام سے کام۔ اُسی وقت میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ یہ نوجوان ضرور اعلیٰ ترقی کرے گا۔

۱۶ اکتوبر ۲۰۰۴ کے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ مذکورہ نوجوان کو ایک بین اقوامی ادارہ میں وائس چیرمین کی جگہ پر فائز کیا گیا ہے۔ اس وقت اُن کی عمر تقریباً ۳۵ سال ہے۔

اپنے کام سے کام کوئی سادہ بات نہیں۔ اپنے کام سے کام کا مطلب اپنے وقت اور اپنی طاقت کو بچانا ہے۔ اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہے کہ صلاحیتیں مفید طور پر استعمال ہوسکیں۔ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کا کوئی جزئی حصہ بھی کسی غیر ضروری کام میں ضائع نہ ہونے پائے۔

جس آدمی کے اندر اپنے کام سے کام کا مزاج ہو وہ دوسروں کے لیے آخری حد تک قابل قبول انسان بن جائے گا۔ وہ دوسروں کے خلاف نہیں بولے گا۔ وہ دوسروں کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ وہ دوسروں کے ساتھ اسی حالت میں تعاون کرنے پر راضی ہوجائے گا جس حالت میں کہ وہ ہیں۔ اسی طرح دوسرے بھی اُس کے ساتھ اسی حالت میں تعاون کرنے پر راضی ہوجائیں گے جس حالت میں کہ وہ خود ہے۔

لوگ اس انسان کو پسند کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے مسئلہ پیدا کئے بغیر اپنا کام کرے اور جو آدمی اپنے کام سے کام رکھے وہ دوسروں کے لیے اسی قسم کا ایک پسندیدہ انسان بن جائے گا۔ اپنے کام سے کام رکھنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ زندگی کا ایک کامیاب اصول ہے۔ جو آدمی اس

اصول کو پوری طرح اپنالے وہ اس دنیا میں کبھی ناکام نہیں ہوسکتا۔

اسی مزاج کا ایک اظہار وہ ہے جس کو اسٹیٹس کوازم (statusquoism) کہا جاتا ہے۔ کسی مقصد میں کامیابی کے لیے اسٹیٹس کوازم واحد کارگر تدبیر ہے۔ اسٹیٹس کوازم کا مطلب ہے۔ حالتِ موجودہ سے ٹکرائے بغیر اپنا کام کرنا:

Doing one's Job without disturbing the existing state of affairs.

کام کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کی سوچ یہ ہو کہ پہلے موجودہ صورت حال کو بدلو۔ اس کے بعد اپنا مطلوب کام شروع کرو۔ یہ راستہ منفی راستہ ہے۔ اس میں یہ نقصان ہے کہ آدمی اپنی قوت وطاقت کا بڑا حصہ غیر ضروری طور پر مفروضہ مشکلات کو دور کرنے میں لگا دیتا ہے۔ جب کہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مشکلات کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کیا جائے۔ اپنے کام سے کام کا مطلب اسی دوسرے طریقہ کو اختیار کرنا ہے۔

اسی دوسرے طریقہ کا نام اسٹیٹس کوازم ہے۔ اصل یہ ہے کہ دنیا کبھی مشکلات یا ناموافق باتوں سے خالی نہیں ہوسکتی۔ مشکلات کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ ایک مشکل کو ہٹاتے ہی دوسری مشکل سامنے آجاتی ہے اور دوبارہ وہی ناموافق صورت حال باقی رہتی ہے جو پہلے تھی۔ ایسی حالت میں عقلمندی یہ ہے کہ مشکلات ومسائل کو زندگی کا ایک لازمی حصہ سمجھا جائے اور اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ مشکلات اور مسائل سے لڑنے والے لوگ ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں اور جو لوگ مشکلات ومسائل سے تعرض نہ کرتے ہوئے اپنا کام شروع کردیں، وہ ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ یہ دنیا کسی ایک کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ سب کے لیے ہے۔ عقلمند آدمی وہ ہے جو یہ جانے کہ دنیا کی اس شاہراہ پر دوسروں کو راستہ دے کر ہی اپنا راستہ ملتا ہے۔ جو آدمی زندگی کی شاہراہ پر دوسروں کو راستہ دیے بغیر آگے بڑھنا چاہے اُس کے لیے جو چیز مقدر ہے وہ قبرستان ہے، نہ کہ مطلوب منزل۔ یہی فطرت کا قانون ہے اور یہی انسانی تاریخ کا فیصلہ بھی۔

نازک پارسل

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سامانوں کے بعض پارسل پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ احتیاط سے اٹھاؤ (handle with care)۔ یہ وہ پارسل ہیں جن میں کوئی نازک چیز (مثلاً شیشہ) پیک ہوتا ہے۔ اس طرح کے پارسلوں کے ساتھ اگر بے احتیاطی کا طریقہ اختیار کیا جائے تو ان کے اندر کا سامان ٹوٹ سکتا ہے۔ اس لیے ایسے پارسلوں کے اوپر یہ ہدایت لکھ دی جاتی ہے کہ ان کو اٹھانے اور رکھنے میں احتیاط کرو۔

پارسلوں میں تو ایسے پارسل بہت کم ہوتے ہیں جن کے ساتھ اس قسم کا نازک مسئلہ وابستہ ہو۔ مگر آج کل کے انسانوں کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگ اسی قسم کے نازک پارسل بنے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی گویا مسٹر پرابلم (Mr Problem) یا مسٹر ہینڈل ودھ کیئر (Mr. Handle with care) بنا ہوا ہے۔

یہ وہ انسان ہیں جن کے ساتھ ذرا سا بھی کوئی خلاف مزاج بات پیش آجائے تو وہ فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے خلاف اس قسم کی شکایتیں لیے پھرتے ہیں کہ اس نے یہ کہہ دیا، اس نے وہ کہہ دیا۔ ایسے لوگ خدا کی زمین پر بوجھ ہیں۔ ان کے ذریعہ کبھی کوئی طاقتور سماج نہیں بن سکتا۔

حقیقی انسان وہ ہے جو لوہے کی مانند ہو۔ جس کو آہستہ رکھئے تب بھی وہ لوہا رہتا ہے اور اگر زور سے پٹک دیجئے تب بھی وہ لوہا رہتا ہے۔ وہ جھٹکوں سے غیر متاثر رہ کر جینا جانتا ہے۔ ایسے انسان کسی سماج کا بہترین سرمایہ ہیں۔ ایسے ہی افراد کے ذریعہ ایک صحت مند سماج وجود میں آتا ہے۔

کامیاب زندگی کے دو اصول ہیں۔ ایک یہ کہ آپ بے مسئلہ انسان بن کر دنیا میں رہیں۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ کے لیے مسئلہ پیدا کرے تو آپ اس کو نظر انداز کر دیجئے۔ اس کے سوا کوئی تیسرا اصول نہیں جو اس دنیا میں کسی کو کامیاب کر سکے۔ کامیابی، ایک لفظ میں، کامیاب منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔

ایک غلطی

ایک انگریزی میگزین میں ایک لطیفہ نظر سے گذرا۔ پال نام کا ایک بچہ اپنے باپ کے ساتھ چڑیا گھر دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں اس نے مختلف قسم کے جانور دیکھے۔ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میرے لیے ایک جانور خرید دیجئے۔ باپ نے کہا کہ اس کا کھانا ہم کہاں سے لائیں گے۔ بچہ نے جواب دیا کہ ان جانوروں میں سے ایک خرید دیجئے جن کے پنجرہ پر لکھا ہوا تھا کہ کھلانا نہیں ہے:

Paul went to the zoo with his father, "Buy an animal for me," he begged, "where would we get his food? asked the father. The boy replied,"Buy one of those where it says on the cage:'No feeding.'"

بچہ کی غلطی کیا تھی۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ پنجرہ کے بورڈ پر جو بات زائرین کی نسبت سے لکھی ہوئی تھی، اس نے اس کو خود جانوروں کی نسبت سے سمجھ لیا۔ اس واقعہ میں ایک نادان بچہ کا کلمہ تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ بہت سے بڑے لوگ بھی اسی نادانی میں مبتلا رہتے ہیں۔

زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت یہ ہے کہ آپ معاملات میں صحیح فیصلہ کریں اور غلط فیصلہ سے بچیں۔ اس کا تعلق صحیح زاویہ نظر سے ہے۔ اگر آپ چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھیں تو آپ صحیح فیصلہ تک پہنچیں گے اور اگر آپ چیزوں کو غلط رخ سے دیکھیں تو آپ کا فیصلہ غلط ہو جائے گا۔ اور جب فیصلہ غلط ہو تو اقدام بھی ہمیشہ غلط ہو جاتا ہے۔

اس کی کیا تدبیر ہے کہ آدمی چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھے اور غلط رخ سے چیزوں کو نہ دیکھے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر بے لاگ سوچ پیدا کرے۔ وہ جذبات کے زیر اثر نہ سوچے۔ وہ متعصبانہ ذہن کے تحت اپنی رائے نہ بنائے۔ وہ اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ وہ چیزوں کو بے آمیز ذہن کے تحت دیکھنے لگے۔ وہ چیزوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھنے کے بعد ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرے۔ ایسے ہی لوگ چیزوں کو صحیح رخ سے دیکھیں گے اور وہ صحیح فیصلہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گے۔

ترقی کا سیلاب

۱۰ اکتوبر ۲۰۰۴ کو پاکستان کے ایک مسلم دانشور سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ملک کی تقسیم نے پاکستان کے مسلمانوں کو خوشحال بنا دیا۔ مگر انڈیا کے مسلمان غریبی میں مبتلا رہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک غلط بات ہے۔ مزید یہ کہ وہ ایک خلاف زمانہ بات (anachronic statement) ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

میں نے کہا کہ آپ ایسا کیجئے کہ آپ دہلی کے مختلف علاقوں میں ایک سو مسلم خاندانوں کا سروے کیجئے۔ ان سے آپ یہ پوچھئے کہ ۱۹۴۷ میں ان کے خاندان کی معاشی حالت کیا تھی اور آج ان کے خاندان کی معاشی حالت کیا ہے۔ اسی طرح آپ لاہور کے مختلف علاقوں سے ایک سو مسلم خاندانوں کو لیجئے اور ان سے آپ یہی سوال کیجئے کہ ۱۹۴۷ میں ان کے خاندان کی معاشی حالت کیا تھی اور آج ان کے خاندان کی معاشی حالت کیا ہے۔ اگر آپ اس قسم کا سروے کریں تو آپ پائیں گے کہ دونوں جگہوں کے مسلمانوں نے تقریباً یکساں طور پر معاشی ترقی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن مسلم رہنماؤں نے معاشی ترقی کو منقسم ہندستان اور غیر منقسم ہندستان کا ظاہرہ سمجھا وہ ایک مہلک غلطی کا شکار ہوئے۔ اس غلطی کا سبب یہ تھا کہ وہ زمانی تبدیلی سے بے خبر تھے۔

اصل یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان زرعی دور میں تھا۔ یہ مبنی بر زمین اقتصادیات (land-based economy) کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں پیسہ صرف لینڈ لارڈ کے پاس ہوتا تھا۔ بقیہ لوگ مجبور تھے کہ وہ غریبی کی حالت میں زندگی گزاریں۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد بقیہ دنیا کی طرح سارے برصغیر ہند میں صنعتی انقلاب شروع ہوگیا۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ ہر جگہ اقتصادی انفجار (economic explosion) آ گیا۔ اب یہ ناممکن ہوگیا کہ پیسہ صرف ایک طبقہ کے پاس ہو اور دوسرے طبقات اس سے محروم رہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے سوکھے کا زمانہ ہو تو پانی صرف اس شخص کے پاس ہوگا جس کے پاس

کنواں ہو لیکن جب موسلا دھار بارش ہو جائے تو ہر جگہ پانی پھیل جائے گا۔ اب ہر آدمی اس پوزیشن میں ہوگا کہ وہ پانی حاصل کر سکے۔ یہی معاملہ قدیم زرعی دور اور جدید صنعتی دور کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ کسی کو ترقی کرنے سے روک دے۔ آج ہر طرف معاشی مواقع کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ آج کوئی شخص یا گروہ اپنی بے عملی سے اپنے آپ کو محروم بنا سکتا ہے لیکن جو لوگ عمل کرنے پر تیار ہوں ان کی معاشی ترقی میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

یہی غلط فہمی ایک اور معاملہ میں شدید تر صورت میں پیش آئی ہے۔ وہ یہ کہ سلطان ٹیپو سے لے کر یاسر عرفات تک تمام مسلم رہنماؤں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کو باعزت زندگی گذارنے کے لیے سیاسی اقتدار ضروری ہے۔ جہاں سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو وہاں مسلمان باعزت طور پر زندگی نہیں گذار سکتے۔ یہ سوچ بھی ایک خلاف زمانہ بات (anachronic statement) کی حیثیت رکھتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسی دوررس تبدیلیاں پیش آئی ہیں جنھوں نے باعزت زندگی کے لیے سیاسی اقتدار کو غیر ضروری بنا دیا ہے۔ اب یہ پوری طرح ممکن ہو گیا ہے کہ کوئی گروہ سیاسی اقتدار کے بغیر عزت اور سر بلندی کی زندگی حاصل کر سکے۔

یہ امکان اُس جدید ظاہرہ کے ذریعہ ممکن ہوا ہے جس کو ادارہ (institution) کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ جدید میں اداروں نے متوازی ایمپائر کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ مثال کے طور پر انڈیا میں مسیحی فرقہ نے ایک چھوٹی اقلیت ہونے کے باوجود ملک میں اپنا ایجوکیشنل ایمپائر بنا لیا ہے۔ اسی طرح پارسی فرقہ نے ملک میں اپنا انڈسٹریل ایمپائر بنا لیا ہے۔ اسی طرح امریکا میں یہودی اقلیت نے اپنا اقتصادی ایمپائر بنا لیا ہے، وغیرہ۔

مسلمانوں کے لیے ہر ملک میں یہ ممکن تھا کہ وہ دانش مندانہ منصوبہ بندی کے ذریعہ اپنے اعلیٰ ادارے بنائیں اور سیاسی اقتدار کے بغیر اپنا ایک متوازی ایمپائر قائم کر سکیں۔ خاص طور پر دعوہ ایمپائر کا میدان تو وہ میدان ہے جہاں مسلمانوں کو اجارہ داری کی حد تک اعلیٰ مواقع حاصل ہیں۔ مگر زمانہ سے بے خبری کی بنا پر مسلمان اب تک اس امکان کو اپنے حق میں استعمال نہ کر سکے۔

گر کر اٹھنا

فیض آباد کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے ایک عربی مدرسہ سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد میں ایک مدرسہ میں استاد ہوگیا۔ پھر مجھے خیال ہوا کہ میں اپنی آمدنی بڑھاؤں۔ میں نے کچھ لوگوں سے پیسہ لیا اور مضاربت کے اصول پر کاروبار شروع کیا۔ مگر کئی سال کی کوشش کے باوجود میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اب میرے اوپر لوگوں کا قرض لدا ہوا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میں سخت احساس کمتری میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ مجھے کچھ مشورہ دیں تاکہ میں اس دلدل سے نکل سکوں۔

میں نے کہا کہ آپ سب سے پہلے یہ کیجئے کہ آپ اپنے ذہن کو بدلئے۔ آپ یہ نہ کہیے کہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہوں، بلکہ یہ کہیے کہ میں احساس غلطی میں مبتلا ہوں۔ کمتری کا احساس آدمی کو پست ہمت بناتا ہے۔ اس کے برعکس غلطی کا احساس آدمی کے اندر نیا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی غلطی کو جان کر دوبارہ زیادہ بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیتا ہے یہاں تک کہ آخر کار وہ کامیاب ہوجاتا ہے۔

اسی طرح بمبئی کے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنی کچھ ناکامیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ اب میں اپنے کو ایک ہارا ہوا انسان سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ یہ نہ سوچیں کہ میں ہار گیا بلکہ آپ یہ سوچئے کہ میں نے غلطی کی۔ آپ جب اس طرح سوچیں گے تو آپ کے اندر نیا حوصلہ ابھرے گا۔ اب آپ یہ سوچیں گے کہ پہلا چانس تو میری غلطی سے کھویا گیا۔ اب مجھ کو چاہیے کہ زیادہ ہوش مندی کے ساتھ کام کروں اور دوسرے چانس کو نہ کھوؤں۔

کامیابی اور ناکامی دونوں کا تعلق سوچ سے ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اگر عملی زندگی میں اس کو کوئی ہار ہوجائے تو وہ سوچ کی سطح پر کبھی نہ ہارے۔ ایسے آدمی کو کوئی بھی چیز کامیابی سے روکنے والی نہیں۔ غلطی کا اعتراف ہاری ہوئی بازی کو دوبارہ نئے حوصلے کے ساتھ جیتنے کا دوسرا نام ہے۔

نہ لڑنا بھی ایک اصول ہے

ہاتھی کے چھوٹے بچہ کا راستہ روکنے کے لیے آپ اس کے آگے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ بچہ جب بڑھتے بڑھتے پورا ہاتھی بن جائے تو آپ کو خود اس کے راستے سے ہٹ جانا چاہیے — یہ فطرت کا ایک اصول ہے۔ اس اصول کی تصدیق خود قرآن میں موجود ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۲۷ میں سلطنت سبا کی تاریخ کا ایک حوالہ دیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے ماضی میں بہت سی فتوحات حاصل کی تھیں۔ مگر جب ان کا مقابلہ سلیمان بن داؤد سے پیش آیا جن کو خدا نے هب لی ملکا لاینبغی لأحد من بعدی (ص ۳۵) کی نسبت دی تھی تو ان کے سربراہِ سلطنت نے جنگی مقابلہ کرنے کے بجائے پرامن مصالحت کا طریقہ اختیار کیا (النمل ۳۴)

یہ زندگی کا ایک اہم اصول ہے۔ اس کا تعلق فرد سے بھی ہے اور قوم سے بھی۔ جو لوگ اس اصول کا لحاظ نہ کریں وہ یقیناً اپنے کو تباہ کرلیں گے، خواہ انہوں نے اپنا یہ عمل جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے نام پر کیوں نہ کیا ہو۔

یہ صحیح ہے کہ تمام طاقتوں کا مالک خدا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ موجودہ دنیا میں خدا نے انسان کو آزادی دی ہے۔ اس آزادی کا تعلق خدا کے تخلیقی نقشہ (creation plan) سے ہے۔ اسی نقشہ کی بنیاد پر ہر انسان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اس لیے آزادی کا یہ نظام ہرگز ختم ہونے والا نہیں۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے اور خدا موجودہ نقشہ کو بدل کر ایک اور نقشہ کے مطابق دنیا کا نظام قائم کرے۔

زندگی میں اقدام سے زیادہ صبر کی اہمیت ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ بے فائدہ ٹکراؤ سے بچ کر اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مستحکم بنانا اور مثبت تعمیر کے میدان میں آگے بڑھتے رہنا۔ صبر زندگی کے ہر مرحلہ میں ضروری ہے۔ معاملات میں صبر کی اہمیت اگر ۹۹ فی صد ہے تو اقدام کی حیثیت صرف ایک فی صد۔

دو قسم کے انسان

کامیاب انسان کون ہے اور ناکام انسان کون۔ ایک جملہ میں دونوں کے درمیان یہ فرق ہے کہ — کامیاب انسان وہ ہے جس کو ناکامی کا اندیشہ لگا ہوا ہو اور ناکام انسان وہ ہے جو کامیابی کے یقین کے ساتھ اپنے عمل کا آغاز کرے۔

اصل یہ ہے کہ دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس پر ہے کہ آدمی اپنے کام کے معاملہ میں سنجیدہ ہے یا نہیں۔ جو آدمی سنجیدہ اور حقیقت پسند ہو وہ اپنے غور وفکر کے ذریعہ اس بات کو جان لے گا کہ دنیا میں خواہ کوئی بھی کام کیا جائے ہر معاملہ میں اس کی اپنی کوشش پچاس فیصد ہوتی ہے اور بقیہ پچاس فیصد عوامل وہ ہیں جو اس کی ذات سے باہر ہیں۔ ان دونوں قسم کے عوامل کی موافق یکجائی سے وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو کامیابی کہتے ہیں۔

کامیابی کے احساس میں جینے سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے بارہ میں زیادہ اندازہ (over-estimation) کی نفسیات میں مبتلا ہو۔ ایسا آدمی غیر حقیقت پسند بن جائے گا۔ وہ اپنی طاقت سے زیادہ بڑا اقدام کر ڈالے گا۔ وہ کامیابی کے فرضی یقین کے تحت ناکامی کی طرف چھلانگ لگا دے گا۔ نہ ملنے والی چیز کے شوق میں وہ ملنے والی چیز کو بھی کھو دے گا۔

اس کے برعکس معاملہ اس انسان کا ہے جو ناکامی کے اندیشہ میں جیتا ہو۔ ایسا آدمی اپنی داخلی نفسیات کی بنا پر ہمیشہ چوکس رہے گا۔ وہ جذباتی فیصلہ کے تحت کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ اُس کا سفر ہاتھی کی مانند ہوگا۔ ہاتھی جب کسی نالہ یا ندی کو پار کرتا ہے تو وہ ہر قدم سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے۔ کیوں کہ اُس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا پاؤں کسی نرم زمین میں دھنس گیا تو اپنے بھاری بھرکم جسم کی بنا پر وہ اس میں پھنس کر رہ جائے گا۔

دانش مند آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے پلس پوائنٹ کے ساتھ اپنے مائنس پوائنٹ کو بھی جانے۔ وہ اپنی کمیوں پر نظر رکھتا ہوا آگے بڑھے۔ ایسا آدمی زندگی کے سفر میں کبھی ناکام نہ ہوگا۔

زندگی کی جدوجہد

زندگی ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد انسان کے پیدا ہوتے ہی شروع ہوتی ہے اور اُس کی عمر کے آخر وقت تک باقی رہتی ہے۔ زندگی کبھی جدوجہد سے خالی نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی کی زندگی جدوجہد سے خالی ہو تو وہ زندگی ہی نہ ہوگی۔ جدوجہد کے بغیر زندگی ایک قسم کی موت ہے، وہ کوئی مطلوب زندگی نہیں۔

جدوجہد انسان کو تازہ دَم رکھتی ہے۔ جدوجہد کے ذریعہ ذہن ارتقاء کرتا ہے۔ جدوجہد کے ذریعہ انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ جدوجہد انسان کو پختگی عطا کرتی ہے۔ جدوجہد کے دوران آدمی کو ہر قسم کے تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ جدوجہد ایک ناقص انسان کو کامل انسان بناتی ہے۔

جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ آدمی یہ جانے کہ جدوجہد کرنے والا تو وہ خود ہے۔ مگر جس دنیا میں اس کو جدوجہد کرنا ہے وہ دنیا خود اُس نے نہیں بنائی۔ بلکہ اُس کو بنانے والا کوئی اور ہے۔ اس دنیا کا اپنا ایک قانون ہے۔ یہ قانون کبھی بدلنے والا نہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی جدوجہد کو دنیا کے نقشہ سے مطابقت کرتے ہوئے چلائے۔ وہ دنیا کے فطری نظام کے ساتھ ٹکراؤ نہ کرے بلکہ اُس کے ساتھ ایڈجسٹ کرتے ہوئے اپنی زندگی کے سفر کو جاری رکھے۔

جدوجہد کیا ہے۔ جدوجہد دراصل مواقع فطرت کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس دنیا میں بے شمار مواقع ہیں۔ یہ مواقع ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ کامیاب وہ ہے جو ان مواقع کو دریافت کرے اور فطرت کے قانون کی رعایت کرتے ہوئے ان کو استعمال کرے۔ اسی دریافت اور اسی استعمال کے نتیجہ کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

کامیابی کوئی اتفاقی چیز نہیں۔ کامیابی دراصل درست عمل کے درست انجام کا دوسرا نام ہے۔ جدوجہد اور کامیابی کے درمیان وہی نسبت ہے جو درخت کے بیج اور درخت کے پھل کے درمیان ہوتی ہے۔ جہاں بیج ہوگا وہاں درخت ہوگا اور جہاں درخت ہوگا وہاں پھل بھی ضرور مل کر رہے گا۔

اعتراف نئے دور کا آغاز

ہر آدمی غلطی کرتا ہے اور سب سے بہتر غلطی کرنے والا وہ ہے جو یہ کہہ سکے کہ میں نے غلطی کی۔ غلطی کا اعتراف غلطی کرنے والے کے لیے نئے درجات کا آغاز ہے۔ جب کہ اس کے برعکس جو آدمی اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرے وہ اسی غلطی میں بدستور پڑا رہے گا۔ وہ کبھی اس سے نکل نہ سکے گا۔ غلطی کا اعتراف نہ کرنا بزدلی ہے اور غلطی کا اعتراف کرنا بہادری۔ غلطی کرنا ایک نقصان کی بات ہے۔ لیکن جب آدمی اپنی غلطی کا اعتراف کرلے تو گویا اُس نے اپنے نقصان کی تلافی کرلی۔

غلطی کا اعتراف تمام انسانی خوبیوں میں سب سے بڑی انسانی خوبی ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ وہ کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کرلے، اُس کے اندر اس اعتراف کے نتیجہ میں ہر قسم کی مثبت خوبیاں پروان چڑھنے لگتی ہیں۔ اُس کے اندر تواضع پیدا ہوتی ہے، اور تواضع علم کی دنیا میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ اس کے اندر اصلاحِ خویش کا مادہ پیدا ہوتا ہے جو اس کی شخصیت کو مسلسل ارتقاء یافتہ شخصیت بناتا رہتا ہے۔ اُس کے اندر حقیقتِ واقعہ کے اعتراف کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے جو اس کو کامل حق تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اُس کے اندر مثبت طرزِ فکر پیدا ہوتا ہے اور مثبت طرزِ فکر تمام انسانی ترقیوں کا زینہ ہے۔ اس کے اندر متکبرانہ نفسیات کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور جو شخص متکبرانہ نفسیات سے پاک ہو وہی وہ شخص ہے جس نے سچی انسانیت کا تجربہ کیا۔

غلطی کا اعتراف ذہن کے بند دروازوں کو کھولتا ہے۔ غلطی کا اعتراف آدمی کو قلب کی تنگی سے بچاتا ہے۔ غلطی کا اعتراف بظاہر ایک سادہ بات ہے۔ مگر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ اتنی بڑی خوبی ہے کہ اس سے بڑی خوبی اور کوئی نہیں۔ جو آدمی اعلیٰ انسانی درجہ تک پہنچنا چاہتا ہو اُس کو ہمیشہ غلطی کے اعتراف کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

غلطی کا اعتراف کرنا ایسا ہی ہے جیسے ٹھوکر کھانے کے بعد دوبارہ اُٹھ کھڑا ہونا۔ ایسے آدمی کا راستہ کبھی رُکنے والا نہیں۔ وہ ضرور منزل پر پہنچ کر رہے گا۔

زحمت بھی رحمت ہے

زحمت میں رحمت (blessing in disguise) ایک مشہور مقولہ ہے۔ یہ مقولہ فطرت کے ایک اُصول کو بتاتا ہے۔ وہ اصول یہ کہ جب کسی انسان کو زحمت پیش آتی ہے تو اس کی ذہنی صلاحیتیں متحرک ہوتی ہیں۔ وہ زیادہ بہتر طور پر کام کرنے کی پوزیشن میں ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو کسی نے ان الفاظ میں کہا ہے کہ — آسانی نہیں بلکہ کوشش، سہولت نہیں بلکہ دشواری وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے:

It is not ease but effort, not facility but difficulty that makes men.

انسان کے اندر غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔ یہ صلاحیتیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ انسان کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگانے کے لیے اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے جس کو شاک ٹریٹمنٹ کہا جاتا ہے۔ زندگی کی مشکلات یہی شاک ٹریٹمنٹ کا کام کرتی ہیں۔ وہ بند ذہن کو کھولتی ہیں۔ وہ جامد انسان کو حرکت میں لاتی ہیں۔ وہ ایک معمولی انسان کو غیر معمولی انسان بنا دیتی ہیں۔ جب آدمی کو کوئی مشکل پیش آئے تو اس کو گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ فطرت نے اس کی زندگی میں وہ عمل (process) جاری کیا ہے جو اس کے اپنے فائدے کے لیے ضروری ہو۔ جو اس کو ترقی کی منزل کی طرف لے جانے والا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ مشکل کو مشکل نہ سمجھے بلکہ وہ اس کو چیلنج سمجھے۔ مشکل کا لفظ بے ہمتی پیدا کرتا ہے۔ مگر جب مشکل کو چیلنج کے روپ میں لیا جائے تو وہی چیز اس کا حوصلہ بڑھانے والی بن جائے گی۔

جب کوئی مشکل پیش آئے تو آدمی کو چاہیے کہ وہ معتدل ذہن کے تحت سوچے۔ وہ دل شکستہ ہونے کے بجائے صورتِ حال کا جائزہ لے۔ وہ اپنے عمل کی ازسرِ نو منصوبہ بندی کرے۔ وہ حالات کے اندر نئے امکانات کو تلاش کرے۔ وہ پورے معاملہ کا دوبارہ اندازہ (re-assessment) کرے۔ جب کوئی آدمی ایسا کرے تو اس کے بعد وہ پائے گا کہ دشواری ایک قابل حل مسئلہ تھی، وہ ایسا مسئلہ نہیں تھی جس کا کوئی حل ہی موجود نہ ہو۔ نادان انسان کے لیے مشکل ایک رکاوٹ ہے۔ مگر دانش مند انسان کے لیے مشکل ترقی کا زینہ بن جاتی ہے۔

حقیقت پسندانہ مزاج

زندگی میں کامیابی کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز حقیقت پسندانہ مزاج ہے۔ محض اپنی ذاتی امنگوں کے تحت میدان میں کود پڑنا جذباتیت ہے، اور جذباتیت کسی کے لیے ناکامی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اس کے برعکس خارجی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقدام کرنا حقیقت پسندی ہے، اور حقیقت پسندی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یہ اصول فرد کے لیے بھی صحیح ہے اور جماعت کے لیے بھی۔

ان دونوں قسم کے اقدامات کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ پہلا اقدام جذباتی اقدام ہے، اور دوسرا اقدام منصوبہ بند اقدام۔ منصوبہ بند اقدام کے لیے سب سے زیادہ اہمیت صبر وتحمل کی ہے۔ آدمی کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ اُس کے اندر وہی جذبہ بھڑک اُٹھتا ہے جو اُس کو اقدام کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ مثلاً حسد، حرص، غصہ، انتقام، وغیرہ۔ اس قسم کے احساسات آدمی کو جذباتی اقدام پر اُبھارتے ہیں۔ یہ ایک جذباتی طوفان کا لمحہ ہوتا ہے۔ اُس وقت جو چیز آدمی کو غلط اقدام سے بچاتی ہے وہ صبر وتحمل کی صفت ہے۔

صبر وتحمل کا یہ فائدہ ہے کہ وہ آدمی کو ہیجانی کیفیت سے بچائے۔ وہ انسان کے اندر اعتدال پیدا کرکے اس کو اس قابل بنائے کہ وہ غیر متاثر ذہن کے تحت سوچ سکے۔ وہ غیر جانب دارانہ جائزہ کے تحت اپنا فیصلہ لے سکے۔ وہ آدمی کے اقدام کو نتیجہ خیز اقدام بنائے۔

جذباتیت یہ ہے کہ آدمی اشتعال انگیزی پر مشتعل ہوجائے۔ کوئی غصہ دلائے تو وہ اُس سے انتقام لینے کے درپے ہوجائے۔ کوئی شوق اس کے اندر اُبھرے تو سوچے سمجھے بغیر وہ اس کی طرف چھلانگ لگادے۔ اس کے برعکس حقیقت پسندی یہ ہے کہ آدمی اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہو۔ کوئی خواہش اُس کے اندر اُبھرے تو وہ ایسا نہ کرے کہ وہ حالات کو نظر انداز کرکے اپنی خواہش کو پورا کرنے کی طرف دوڑ پڑے۔ جذباتیت کا نتیجہ عجلت پسندی ہے۔ اس کے مقابلہ میں حقیقت پسندی سے یہ مزاج بنتا ہے کہ آدمی جو کام کرے وہ اس کو بھرپور جائزہ لینے کے بعد کرے۔

کامیاب زندگی

ہر آدمی کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کو حقیقی معنوں میں کامیابی حاصل ہو۔ اس فرق کا سبب یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگ خوش قسمت ہیں اور کچھ لوگ بدقسمت۔ پیدا کرنے والے نے کسی بھی مرد یا عورت کو بدقسمت پیدا نہیں کیا۔ خدا کے کارخانہ سے ہر آدمی خوش قسمت ہی بنا کر پیدا کیا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو الطاف حسین حالی نے ایک آیت کے حوالہ سے اس طرح بیان کیا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

حالت کو بدلنے کا خیال کرنا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ غیر جانب دارانہ طور پر اپنی حالت کا اندازہ کریں۔ اس کے بعد ممکن مواقع کو دریافت کریں اور یہ جانیں کہ ان مواقع کو استعمال کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ یہی کامیابی کا آغاز ہے۔ کامیابی پہلے درجۂ شعور میں حاصل کی جاتی ہے، اس کے بعد وہ درجۂ عمل تک پہنچتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بے شعوری بھی اُتنی ہی مہلک ہے جتنی کہ بے عملی۔ جو آدمی شعور کی صلاحیت سے خالی ہو وہ گویا اس قابل ہی نہیں کہ معاملات میں درست رائے قائم کر سکے۔ اپنی بے شعوری کی بنا پر وہ معاملات میں غلط رائے قائم کرے گا اور غلط قسم کے اقدامات کرے گا۔ اور حقائق کی اس دنیا میں غلط اقدام کبھی درست نتیجہ تک پہنچنے والا نہیں۔ اس دنیا میں باشعور آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور بے شعور آدمی ہمیشہ ناکام۔

اس دنیا کو خدا نے اپنے مقرر نقشہ کے مطابق بنایا ہے۔ اس دنیا میں خدا کا ابدی قانون نافذ ہے۔ اس قانون کے مطابق ہی کسی کو یہاں کامیابی یا ناکامی حاصل ہوتی ہے۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اس قانونِ فطرت کو سمجھے اور اس کی رعایت کرتے ہوئے اپنے عمل کا نقشہ بنائے۔ جو لوگ ایسا کریں وہی حقیقت پسند لوگ ہیں، اور جو لوگ حقیقت پسند ہوں اُن کے لیے اس دنیا میں کامیابی اُتنی ہی یقینی ہے جتنا کہ رات کے بعد دن کا آنا یا شام کی تاریکی کے بعد دوبارہ اگلی صبح کو روشنی کا ظاہر ہونا۔

سادگی کی اہمیت

سادگی کی اہمیت کسی انسان کے لیے اتنی زیادہ ہے کہ اس کا کوئی بدل نہیں۔ سادگی اعلیٰ کامیابی کا زینہ ہے۔ جو شخص سادگی کو اختیار نہ کر سکے وہ یقینی طور پر کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

سادگی محض ایک اخلاقی صفت نہیں۔ سادگی ایک مکمل طرز حیات ہے۔ سادگی آدمی کو اس سے بچاتی ہے کہ وہ اپنی طاقت کا کوئی حصہ بے فائدہ طور پر ضائع کرے۔ سادہ آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال اور اپنے وقت کو زیادہ مفید طور پر استعمال کرے۔ سادگی دوسرے لفظوں میں، وقت اور مال کو زیادہ بہتر طور پر مینج (manage) کرنے کا فن ہے۔

سادگی کا تعلق ہر چیز سے ہے۔ لباس، کھانا، فرنیچر، سواری، مکان، تقریبات، وغیرہ۔ زندگی کی ہر سرگرمی میں آدمی کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب رہتا ہے۔ یا تو وہ تعیش اور نام ونمود کے پہلو کو سامنے رکھے اور اپنا مال ان میں خرچ کرتا رہے۔ یا وہ صرف اپنی ناگزیر ضروریات کو دیکھے اور اپنے مال کو صرف حقیقی ضرورت کی مدوں میں خرچ کرے۔

غیر ضروری مدوں میں اپنا مال خرچ کرنے کا نقصان صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں آپ کا مال غیر ضروری طور پر ضائع ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ جو لوگ ایسا کریں وہ مادی نمائش کی چیزوں میں الجھے رہتے ہیں۔ ان کا فکر سطحی چیزوں سے اوپر نہیں اٹھ پاتا۔ اس کا نقصان اسے اس شدید صورت میں بھگتنا پڑتا ہے کہ اس کا ذہنی ارتقاء (intellectual development) رک جاتا ہے۔ ایسا انسان بظاہر زرق برق چیزوں کے درمیان دکھائی دیتا ہے۔ مگر اپنے ذہن کے اعتبار سے وہ حیوان کی سطح پر جینے لگتا ہے۔ وہ اعلیٰ ذہنی ترقی سے محروم رہ جاتا ہے۔

سادگی روحانیت کا لباس ہے۔ سادگی روحانی انسان کا کلچر ہے۔ سادگی ربانی انسان کی غذا ہے۔ سادگی فطرت کا اصول ہے، سادگی سنجیدہ انسان کی روش ہے، سادگی ذمہ دارانہ زندگی کی علامت ہے، سادگی بامقصد انسان کا طرزِ حیات ہے۔

محنت، پلاننگ

قدیم زمانہ سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے سب سے بڑی چیز محنت ہے۔ قدیم عربی مقولہ ہے کہ: من جد وجد (جس نے کوشش کی اُس نے پایا)۔ ہر زبان میں اس طرح کے مقولے ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ محنت کامیابی کا زینہ ہے۔

یہ بات درست ہے اور آج بھی محنت کی اُسی طرح اہمیت ہے جس طرح اُس کی اہمیت پہلے تھی۔ مگر نئی تبدیلیوں کے بعد یہ فارمولا اب دونکاتی فارمولا میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اب محنت کے ساتھ منصوبہ بندی (planning) بھی لازمی طور پر ضروری ہوگئی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جدید اُصول کے مطابق، منصوبہ بندی کا درجہ پہلے ہے اور محنت کا درجہ اس کے بعد۔

منصوبہ بندی یہ ہے کہ عملی طور پر کام شروع کرنے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے۔ مواقع اور امکانات کو دریافت کیا جائے۔ تمام متعلق پہلوؤں کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ وہ کام کیا جائے جس کو آج کل کی زبان میں نیٹ ورکنگ کہا جاتا ہے۔

محنت کی حیثیت اگر جسمانی عمل کی ہے تو منصوبہ بندی کی حیثیت دماغی عمل کی۔ پہلے زمانہ میں بھی کامیابی کے لیے دماغی عمل کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ میں دماغی عمل کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کارخانہ کھولنے سے لے کر جنگ لڑنے تک اور اسکول چلانے سے لے کر حکومتی نظام قائم کرنے تک ہر جگہ دماغی عمل نے اولین اہمیت حاصل کرلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی قومیں جو قدیم دور میں آگے تھیں اب وہ پیچھے چلی گئی ہیں۔ کیوں کہ اُنہوں نے اپنے کام کو منصوبہ بندی کے دور میں نہیں پہنچایا۔ قدیم زمانہ میں کسی کام کو چلانے کے لیے محنت کافی ہوتی تھی۔ مگر جدید منصوبہ بندی نے علم کو بہت زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ کامیاب منصوبہ بندی وہی شخص کرسکتا ہے جس نے اپنے اندر علم کی صلاحیت پیدا کرلی ہو۔ علم کی صلاحیت کے بغیر کوئی شخص یا گروہ اپنے کام کو منصوبہ بند انداز میں منظم نہیں کرسکتا۔

نہ کرنا بھی کام ہے

عام طور پر لوگ صرف کرنے کو کام سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ بعض اوقات یہ بھی کام ہوتا ہے کہ کچھ نہ کیا جائے۔ بولنے کے بجائے خاموشی اختیار کی جائے، اقدام کے بجائے عمل سے پرہیز کیا جائے، وار کا جواب دینے کے بجائے وار کو خالی جانے دیا جائے۔

جنگل کے جانور فطرت کی تعلیم کے تحت ایسا ہی کرتے ہیں کہ جب وہ کوئی طوفان دیکھتے ہیں تو وہ زمین پر لیٹ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ طوفان کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ ان سے ٹکرائے بغیر آگے بڑھ جائے۔

اصل یہ ہے کہ کام برائے کام کوئی چیز نہیں۔ کام وہ ہے جو نتیجہ رخی (result-oriented) کام ہو۔ وہی کام حقیقی کام ہے جو مثبت نتیجہ برآمد کرے۔ جو کام اپنے نتیجہ کے اعتبار سے بے فائدہ ہو یا جس کام کا الٹا نتیجہ نکلے وہ کام نہیں۔ بے نتیجہ کام کرنا کام کرنا نہیں ہے بلکہ وہ کام کو بگاڑنا ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ بولنے سے پہلے سوچا جائے۔ عمل کرنے سے پہلے صورت حال کا جائزہ لیا جائے۔ اقدام کرنے سے پہلے اس کی منصوبہ بندی کی جائے۔ دانشمند آدمی کرنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ شخص نادان ہے جو سوچے بغیر عمل کے میدان میں کود پڑے اور جب اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے تو وہ دوسروں پر اس کا الزام دینے لگے۔ بغیر سوچے ہوئے کوئی کام کرنا ایسا ہی ہے جیسے کشتی کے بغیر سمندر میں داخل ہو جانا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجرد حرکت کوئی کام نہیں، حرکت کو بامقصد ہونا چاہئے۔ یہی انسان کی انسانیت کے مطابق ہے۔ جب ایک آدمی کسی مفید کام کو انجام دے تو اس نے اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو ثابت کیا اور جب ایک شخص ایک ایسا کام کرے جس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلے تو اس نے گویا اپنے انسان ہونے کی حیثیت ہی کو مشتبہ بنا دیا۔ حقیقی انسان وہ ہے جو نتیجہ خیز کام کرے، بے نتیجہ کام کرنے والا سرے سے انسان ہی نہیں۔

تعلیمی پیغام

جموو کشمیر میں ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے جس کا نام مسلم ایجوکیشن ٹرسٹ ہے۔ اس ادارہ کے تحت مسٹر خورشید بسمل اور ان کے ساتھیوں نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۶ کو تھنہ منڈی میں ایک اسکول قائم کیا۔ یہ اسکول ترقی کر کے اب ایک بڑا ادارہ بن گیا ہے۔ یکم نومبر ۲۰۰۴ کو اس ادارہ کا ۲۹ واں فاؤنڈیشن ڈے منایا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو مزید ترقی دے۔ وہ نئی نسل کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کا ذریعہ بنے۔

تعلیم بلاشبہ تمام ضروری چیزوں میں سب سے زیادہ اہم چیز ہے۔ تعلیم نہ صرف دنیوی زندگی کو درست کرنے کے لیے ضروری ہے بلکہ فارسی شاعر کے الفاظ میں، خدا کی معرفت بھی علم کے بغیر نہیں ملتی: کہ بے علم نتواں خدا را شناخت۔

علم کے ذریعہ آدمی زندگی کا سلیقہ سیکھتا ہے۔ علم کے ذریعہ اس کو ماضی اور حال کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ علم کے ذریعہ وہ مواقع اور امکانات کو جانتا ہے۔ علم آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے عمل کی نتیجہ خیز منصوبہ بندی کرے۔ علم کے ذریعہ آدمی صحیح اور غلط کی پہچان حاصل کرتا ہے۔ علم کے ذریعہ آدمی جانتا ہے کہ جذباتیت اور حقیقت پسندی میں کیا فرق ہے۔

علم کے ذریعہ آدمی کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو آرٹ آف ڈیفرنس مینجمنٹ (art of difference management) کہا جاتا ہے۔ علم آدمی کو وہ شعور دیتا ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے سماج کا صحت مند ممبر بنے۔ علم سے آدمی کو وہ بصیرت حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ تخریبی اقدام اور تعمیری اقدام کے فرق کو جانے۔ علم آدمی کو یہ صلاحیت عطا کرتا ہے کہ وہ ممکن اور ناممکن میں تمیز کر سکے، وہ ناممکن کو چھوڑ کر ممکن میں اپنی طاقت کو لگائے۔

علم انسان کو مکمل انسان بناتا ہے۔ علم سے آدمی اپنے آپ کو پہچانتا ہے اور خدا کو بھی۔ علم کے ذریعہ دین میں بھی ترقی حاصل ہوتی ہے اور دنیا میں بھی۔ علم انسان کو حیوانیت سے اُٹھا کر حقیقی انسان کے درجہ تک پہنچاتا ہے۔

۱۔ اسلامک گائڈنس سینٹر (منگلور) نے اپنے خط مورخہ ۲۳ ستمبر ۲۰۰۴ میں یہ خبر دی ہے: ہم چند احباب دعوت دین کا کام کرتے ہیں۔ گھر گھر جا کر دین کی دعوت دیتے ہیں۔ خصوصاً غیر مسلموں کے گھر جاتے ہیں۔ اللہ کے فضل سے بہت اچھا کام ہو رہا ہے۔ غیر مسلمین بہت اچھی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ ابھی تک تم لوگ کہاں تھے۔ یہاں کی زبان کنڑی ہے۔ سارا کام اسی زبان میں ہوتا ہے۔ آپ کا ایک پمفلٹ انسان اپنے آپ کو پہچان بھی اسی زبان میں ترجمہ کر کے لوگوں کو دے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ سے ہماری درخواست ہے کہ آپ ہماری حوصلہ افزائی کریں۔

۲۔ انڈیا ٹوڈے (نئی دہلی) کے ٹی وی چینل آج تک کے نمائندہ مسٹر سنجے نندن (Sanjay Nandan) نے ۱۲ نومبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اُن کے سوالات کا تعلق کانچی کے شنکر آچاریہ کی گرفتاری سے تھا۔ جواب میں بتایا گیا کہ ہمارے ملک میں قانون ہر ایک کے لیے یکساں ہے۔ مگر قانونی کارروائی کرتے ہوئے اس کا لحاظ کرنا چاہیے کہ سماج میں کسی شخص کا مرتبہ کیا ہے۔ قانون کا انطباق کرتے ہوئے انسانی احترام کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۳۔ اسٹار نیوز ٹی وی چینل (نئی دہلی) کے نمائندہ انور چوہان (Anwar Chauhan) نے ۱۳ نومبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایٹہ میں ایک شادی کے بعد مقررہ مدت سے پہلے ولادت ہوگئی۔ اس سلسلہ میں یہ سوال تھا کہ کیا ڈی این اے ٹسٹ کا استعمال اس معاملہ میں جائز ہے۔ جواب میں بتایا گیا کہ ڈی این اے ٹسٹ ایک سائنٹفک میتھڈ ہے۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی کے خون کے ٹسٹ کے معاملہ میں اس کا استعمال بالکل جائز ہے۔

۴۔ وژن نیوز (Vision News) کی نمائندہ ارونا ملا پارڈی (Aruna Malapardy) نے ۱۴ نومبر ۲۰۰۴ کو عید الفطر کے بارہ میں صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ عید الفطر رمضان کے خاتمہ پر آتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لیے اجتماعی ملاقات کا دن ہے۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ عید الفطر کی تاریخ یکم شوال کی چاند کو دیکھ کر متعین ہوتی ہے۔ برصغیر ہند میں چاند کو آنکھوں سے دیکھ کر تاریخ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مگر عرب دنیا میں کیلینڈر کے اصول پر عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی تاریخ کا اعلان حکومت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

۵۔ اسپریچول میسیج کی دعوت پر نومبر ۲۰۰۴ کے تیسرے ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ ۱۷۔۲۱ نومبر کے درمیان وہاں مختلف موضوعات پر کئی پروگرام ہوئے۔ ان پروگراموں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ اس کی روداد سفرنامہ کے تحت انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۶۔ انڈین ایکسپریس (بمبئی) کے نمائندہ سویتا رامن جن (Sweta Ramanujan) نے ۱۸ نومبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ہندستانی مسلمان کے موضوع پر تھا۔ جوابات کے دوران بتایا گیا کہ ہندستان کے مسلمانوں کی تصویر جو میڈیا میں آتی ہے وہ واقعہ کے مطابق نہیں۔ آج کل مسلمانوں میں بڑے پیمانہ پر تعلیمی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اسی کے ساتھ اُن کے جذباتی رویے میں بہت زیادہ کمی آئی ہے۔ اب وہ زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنے لگے ہیں۔

۷۔ ایک پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے سہارن پور کا سفر کیا۔ یہ سفر ۱۹۔۲۰ نومبر ۲۰۰۴ کو ہوا۔ اس سلسلہ میں سہارنپور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مختلف پروگرام ہوئے۔ ایک پریس کانفرنس بھی ہوئی۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ میں شائع کردی جائے گی۔

۸۔ انڈیا انٹرنیشنل سینٹر (نئی دہلی) میں ۲۲ نومبر ۲۰۰۴ کو انٹرنیشنل سمٹ ہوئی۔ اس کا موضوع یہ تھا:

Transcending Religious Boundaries

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر اسلام کی روشنی میں خطاب کیا۔ یہ پورا پروگرام انگریزی زبان میں تھا۔

۹۔ بی بی سی لندن کی نمائندہ مزسیما چشتی نے ۲۳ نومبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ مذہبی ادارے کو کس طرح چلایا جائے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہبی ادارہ کو وہی حیثیت دی جائے جو آج کل یونیورسٹی کو حاصل ہے۔ یونیورسٹی اسٹیٹ کے ماتحت ہوتی ہے۔ مگر موجودہ نظام کے تحت اس کو ایک ایسا ادارہ مانا گیا ہے جس کو مکمل اندرونی خودمختاری حاصل رہتی ہے۔ یہی ماڈل مذہبی اداروں کے لیے بھی درست ہے۔

۱۰۔ سہارنپور میں نیشنل میڈیکل کالج کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم ہوا ہے۔ اس کا افتتاح ۲۸ نومبر ۲۰۰۴ کو ہوا۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ ۲۷ نومبر کو سہارنپور گئے اور ۲۸ نومبر کو واپسی ہوئی۔ اسی دوران افتتاحی تقریب کے علاوہ کئی پروگرام ہوئے۔ ان پروگراموں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ ۲۷ نومبر کی شام کو ایک پریس کانفرنس بھی ہوئی۔ اس پریس کانفرنس میں اکثر اخباروں کے نمائندے شریک تھے۔ اس سفر کی روداد ماہنامہ الرسالہ میں انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کردی جائے گی۔

۱۱۔ ای ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۵ دسمبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویو کا موضوع بابری مسجد کا مسئلہ تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کے لیے دوسرے تمام آپشن (options) ختم ہو چکے ہیں۔ اب اس معاملہ میں ان کے لیے ایک ہی آپشن ہے۔ وہ یہ کہ جلسہ اور تقریر کا طریقہ چھوڑ دیں اور عدالت جو فیصلہ دے اس کو بلاشرط مان لیں۔

مطالعۂ قرآن
سیرت رسول
مسائل اجتہاد

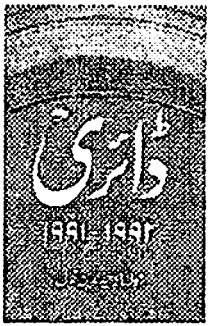

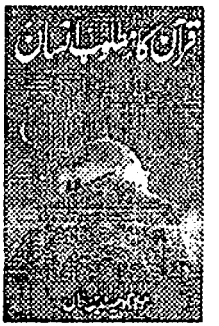

مذہب اور سائنس
ڈائری
1991-1992
تعمیر انسانیت
قرآن کا مطلوب انسان
سفرنامہ اسپین و فلسطین
اسفار ہند
اسلام دین فطرت

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ ایڈیشن کا نام دی اسپریچول میسیج (The Spiritual Message) ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

دی اسپریچول میسیج، فی کاپی -/15 روپے، سالانہ -/165 روپے۔

خط و کتابت کا پتہ ہے:

The Spiritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 2834 1654/ 28346079/ 2821 8609, Fax: 2823 6323

الرسالہ کی نئی مطبوعات

● سیرتِ رسول	صفحات	۱۷۲
● امنِ عالم	صفحات	۲۰۸
● عورت: معمارِ انسانیت	صفحات	۲۵۰

حیدرآباد میں **مولانا وحید الدین خاں** کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں۔ ٹیلی فون پر آرڈر دے کر بھی کتابیں منگوائی جاسکتی ہیں:

حافظ عبد الغفار صاحب
مکان 16-8-663 (بی کلاس 160)
فٹبال گراؤنڈ، جدید ملک پٹھ، حیدرآباد 500024
موبائل: 9440340990

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs. 110	ایک سال	$20/£10	$10/£5
دو سال	Rs. 200	دو سال	$35/£18	$18.£8
تین سال	Rs. 300	تین سال	$50/£25	$25/£12
پانچ سال	Rs. 480	پانچ سال	$80/£40	$40/£18

Goodword Books Pvt. Ltd.

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. (9111) 2435 6666, 2435 5454, Fax (9111) 2435 7333, e-mail: info@goodwordbooks.com

ORDER FORM (URDU BOOKS)

QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES
	60.00	مضامین اسلام		12.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)		400.00	تذکیر القرآن (مکمل، مجلد)
	10.00	باغ جنت		80.00	ڈائری (جلد اول)		250.00	تذکیر القرآن (پیپر بیک)
	10.00	نار جہنم		65.00	کتاب زندگی		85.00	اسباق تاریخ
	10.00	سچا راستہ		25.00	اقوال حکمت		60.00	تعمیر حیات
	10.00	دینی تعلیم		10.00	تعمیر کی طرف		50.00	تعمیر انسانیت
	10.00	خلیج ڈائری		20.00	تبلیغی تحریک		125.00	سفرنامہ غیرملکی اسفار جلد اول
	10.00	رہنمائے حیات		25.00	تجدید دین		125.00	سفرنامہ غیرملکی اسفار، جلد دوم
	10.00	تعدد ازواج		35.00	عقلیات اسلام		80.00	اسلام: ایک تعارف
	60.00	ہندستانی مسلمان		25.00	قرآن کا مطلوب انسان		60.00	اللہ اکبر
	10.00	روشن مستقبل		10.00	دین کیا ہے؟		50.00	پیغمبر انقلاب
	10.00	صوم رمضان		20.00	اسلام دین فطرت		65.00	مذہب اور جدید چیلنج
	8.00	اسلام کا تعارف		10.00	تعمیر ملت		35.00	عظمت قرآن
	20.00	علما اور دور جدید		10.00	تاریخ کا سبق		60.00	عظمت اسلام
	60.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین		8.00	فسادات کا مسئلہ		10.00	عظمت صحابہ
	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے		8.00	انسان اپنے آپ کو پہچان		80.00	دین کامل
	10.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ		8.00	تعارف اسلام		45.00	الاسلام
	10.00	یکساں سول کوڈ		8.00	اسلام پندرہویں صدی میں		50.00	ظہور اسلام
	10.00	اسلام کیا ہے؟		12.00	راہیں بند نہیں		40.00	اسلامی زندگی
	40.00	میوات کا سفر		10.00	ایمانی طاقت		35.00	احیاء اسلام
	35.00	قیادت نامہ		10.00	اتحاد ملت		65.00	راز حیات
	8.00	منزل کی طرف		20.00	سبق آموز واقعات		40.00	صراط مستقیم
	125.00	اسفار ہند		10.00	زلزلۂ قیامت		60.00	خاتون اسلام
	100.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹		12.00	حقیقت کی تلاش		50.00	سوشلزم اور اسلام
	70.00	قال اللہ و قال الرسول		8.00	پیغمبر اسلام		30.00	اسلام اور عصر حاضر
	90.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱		10.00	آخری سفر		40.00	الربانیۃ
	80.00	مطالعۂ قرآن		10.00	اسلامی دعوت		45.00	کاروان ملت
	40.00	مذہب اور سائنس		20.00	حل یہاں ہے		30.00	حقیقت حج
	100.00	دین و شریعت		25.00	امہات المومنین		35.00	اسلامی تعلیمات
	60.00	مطالعۂ سیرت		85.00	تصویر ملت		25.00	اسلام دور جدید کا خالق
	10.00	خدا اور انسان		50.00	دعوت اسلام		40.00	حدیث رسول
	8.00	ہندستان آزادی کے بعد		40.00	دعوت حق		35.00	راہ عمل
	100.00	مسائل اجتہاد		80.00	نشری تقریریں		80.00	تعبیر کی غلطی
	120.00	مطالعۂ حدیث		60.00	دین انسانیت		25.00	دین کی سیاسی تعبیر
	100.00	امن عالم		50.00	فکر اسلامی		10.00	عظمت مومن
	100.00	عورت: معمار انسانیت		50.00	شتم رسول کا مسئلہ		8.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد
				8.00	طلاق اسلام میں		8.00	تاریخ دعوت حق

RNI 28822/76 • U(SE) 12/2003-05
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2003-05